www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

January 2004 ● No. 326

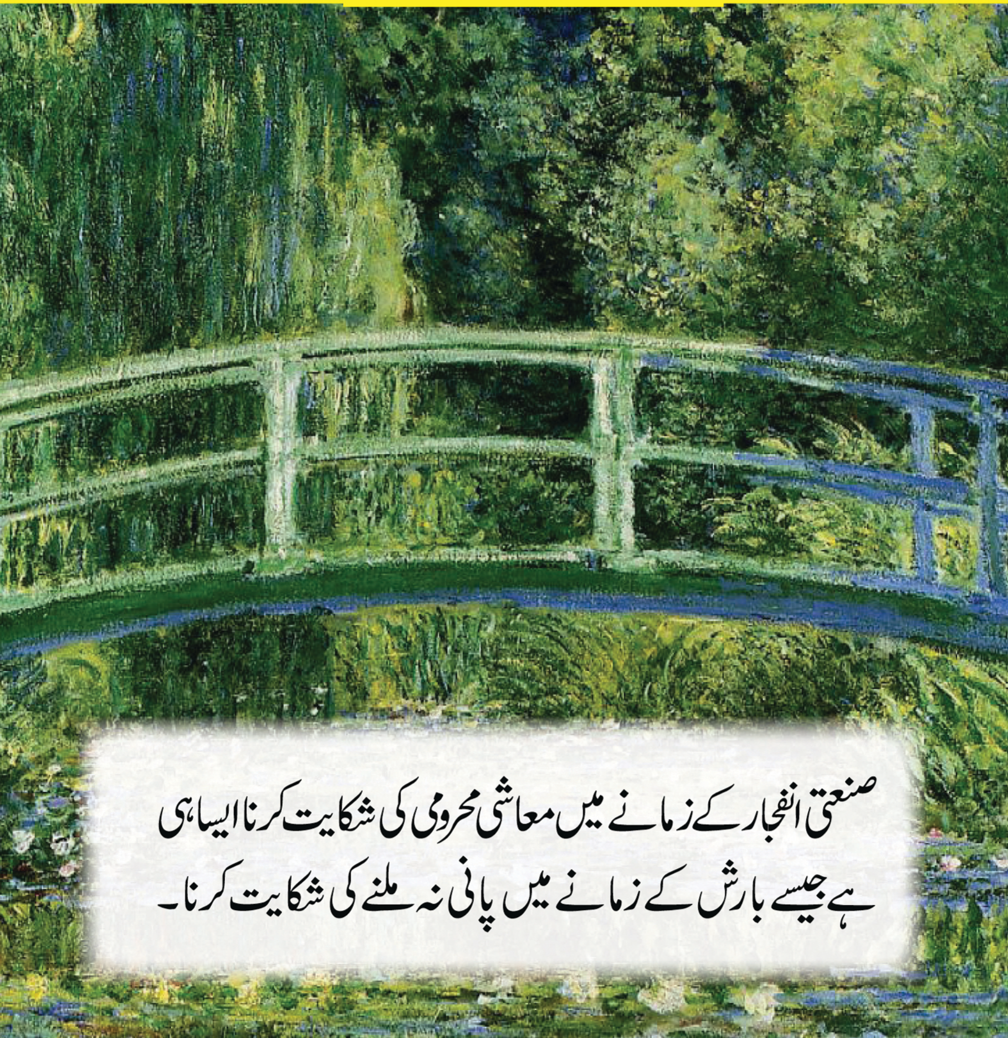

صنعتی انفجار کے زمانے میں معاشی محرومی کی شکایت کرنا ایسا ہی
ہے جیسے بارش کے زمانے میں پانی نہ ملنے کی شکایت کرنا۔

چند احادیث

حدیث کی کتابوں میں کوئی کتاب النساء جیسا چیپٹر نہیں ہوتا۔ تاہم مختلف موضوعات کے تحت عورتوں کے بارہ میں کثرت سے ایسی روایتیں آئی ہیں جو عورتوں کے بارہ میں اسلام کی تعلیم کو بتاتی ہیں۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا درجہ انسانی سماج میں کیا ہے۔ یہاں حدیث کی مختلف کتابوں سے اس قسم کی کچھ روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ یہ روایتیں بتاتی ہیں کہ اسلام کے نقشۂ حیات میں عورت کا مقام کیا ہے۔

۱۔ عورت نصف انسانیت

پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہ صدیقہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا ایک سوال کیا گیا تھا۔ اس مسئلہ کا جواب دیتے ہوئے آپ نے مزید فرمایا: عورتیں بلاشبہہ مرد کا شقیقہ ہیں (**انما النساء شقائق الرجال**) **ابو داؤد، کتاب الطهارة، الترمذی، کتاب الطهارة، مسند احمد ۶/۲۵۶۔**

شقیق یا شقیقہ عربی زبان میں، کسی چیز کے درمیان سے پھٹے ہوئے دو برابر برابر حصے کو کہتے ہیں۔ اسی سے دردِ شقیقہ بولا جاتا ہے۔ یعنی وہ درد جو سر کے آدھے حصہ میں ہو۔ اوپر کی روایت میں اسی مفہوم میں عورت کو مرد کا شقیقہ کہا گیا ہے۔ یہ عورت کی حیثیت کی نہایت صحیح تعبیر ہے۔ اسلام کے مطابق، عورت اور مرد دونوں ایک کُل کے دو برابر برابر اجزاء ہیں۔ اس کُل کا آدھا عورت ہے اور اُس کا آدھا مرد۔ اس اعتبار سے یہ بات عین درست ہوگی کہ عورت کو نصفِ انسانیت کا لقب دیا جائے۔

۲۔ اخلاق کا معیار

عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے اچھا ہوں۔ اور جب تمہارا ساتھی انتقال کر جائے تو تم اُس کے لیے دعا کرو (**خیر کم خیر کم لأهله و أنا خیر کم**

لأھلی و اذا مات صاحبکم فدعوہ)الترمذی،الدارمی،بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح،جلد ۲،صفحہ ۹۷۱ (رقم الحدیث ۳۲۵۲)

گھر کی زندگی میں شوہر اور بیوی مستقل طور پر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بار بار ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ غصہ اور نفرت کے جذبات جاگتے ہیں۔ ایسی حالت میں حُسن اخلاق کا سب سے بڑا آزمائشی مقام اُس کا اپنا گھر ہے۔ جو مرد اپنے گھر کے اندر بہتر سلوک کا ثبوت دے وہ اخلاقی امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ اسی طرح جو عورت اپنے گھر کے اندر حُسن سلوک پر قائم رہے اُس نے آزمائش میں کامیابی حاصل کی۔ ایسے عورت یا مرد باہر کی زندگی میں بھی کامیاب رہیں گے۔

گھر کی زندگی میں جب ایک ساتھی کو موت آجائے اور دوسرا ساتھی زندہ رہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زندہ کے دل میں وفات یافتہ کے بارہ میں غم اور ماتم کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ایسے حادثہ کے موقع پر اپنے جذبات کا رُخ دعا کی طرف کردیا جائے۔ جو کچھ دنیا میں کھویا گیا ہے اُس کو آخرت میں پانے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ شرافت کی پہچان

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کی عزت وہی شخص کرے گا جو شریف ہو اور عورتوں کو وہی شخص بے عزت کرے گا جو کمینہ ہو (**ما اکرم النساء الا کریم و ما اھانھن الا لئیم**)

عزت اور مرتبہ کے لحاظ سے عورت اور مرد دونوں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر زندگی کے نظام میں دونوں کے درمیان تقسیمِ کار کا اُصول رکھا گیا ہے۔ مرد پر نسبتاً سخت کام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور عورت کو مقابلۃً نرم کام کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس تقسیمِ کار کی بنا پر عورت اور مرد کی جسمانی بناوٹ میں فرق رکھا گیا ہے۔ مرد جسمانی اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور عورت جسمانی اعتبار سے نسبتاً غیر قوی ہے۔

اس فرق کی بنا پر مرد کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ عورت کو اپنی چیرہ دستی کا شکار بنا سکے۔ مگر خدا کے نزدیک یہ مرد کے لیے ایک امتحان کا پرچہ ہے۔ مرد کو چاہیے کہ وہ جسمانی اعتبار سے قوی ہونے کے باوجود عورت کا پورا احترام کرے۔ خدا کی شریعت کا اُصول یہ ہے کہ شریف انسان وہ ہے جو کمزور کے مقابلہ میں شریف ثابت ہو۔ وہ انسان ایک کمینہ انسان ہے جو کسی کو کمزور پا کر اُس کو اپنی زیادتی کا نشانہ بنانے لگے۔

۴۔ ہر حال میں خیر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے اگر اس کی کوئی خصلت اس کو ناپسند ہوگی تو کوئی دوسری خصلت اس کی پسند کے مطابق ہوگی۔ (لا یفرک مومن مومنة۔ ان کرہ منها خلقاً رضی منها آخر)

صحیح مسلم، کتاب الرضاع

فطرت کی تقسیم کا عام اُصول یہ ہے کہ کسی ایک عورت یا کسی ایک مرد کو ساری خوبیاں نہیں دی جاتیں۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کو ایک خوبی زیادہ ملتی ہے تو دوسری خوبی میں اُس کے ساتھ کمی کر دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک عورت کو اگر ظاہری جسمانی خصوصیات میں زیادہ حصہ ملا ہو تو داخلی خصوصیات میں وہ اُس نسبت سے کم ہوگی۔ اسی طرح اگر ایک عورت داخلی سیرت میں زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو ظاہری صفات کے اعتبار سے وہ نسبتاً کم ہوگی۔ یہ فطرت کا ایک عام اُصول ہے جس میں بہت کم استثناء پایا جاتا ہے۔

مذکورہ حدیثِ رسول میں اسی فطری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کسی مرد کی بیوی اگر ایسی ہو جو ظاہری صورت کے اعتبار سے زیادہ پُرکشش نہ ہو تو اُس کو بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ فطرت کے قانون پر اعتماد کرتے ہوئے اُس کے اندر یہ یقین ہونا چاہیے کہ اُس کی بیوی سیرت کے اعتبار سے یقینی طور پر زیادہ بہتر ہوگی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ حقیقی زندگی میں صورت کے مقابلہ میں سیرت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

۵۔ بہتر اخلاق کی پہچان

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومنین میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے۔ اور تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے اچھا ہو۔ (**اکمل المؤمنین ایماناً احسنهم خلقاً و خیارکم خیارکم لنسائهم**)۔

الترمذی، بحوالہ مشکوۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۷۳ (رقم الحدیث ۳۲۶۴)

یہ حدیث بظاہر مرد کے لیے ہے۔ مگر اپنے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے وہ مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت جب شادی شدہ زندگی اختیار کرکے ایک ساتھ رہتے ہیں تو بار بار دونوں کے درمیان اختلاف اور شکایت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں غصہ اور نفرت اور انتقام کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہ موقع دونوں کے لیے امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر دونوں صبر اور تحمل کا طریقہ اختیار کرکے اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ بہتر مرد اور زیادہ بہتر عورت ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ صحیح اسلامی رویہ اختیار کرکے خدا کے یہاں اپنا درجہ بلند کر سکتے ہیں۔

۶۔ بہتر خاتون کون

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ عورتوں میں سب سے بہتر عورت کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ عورت کہ مرد جب اُسے دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے۔ اور مرد جب کسی کام کے لیے کہے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور اپنے نفس اور اپنے مال میں وہ مرد کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرے (**عن ابی هريرة قال: سئل رسول الله ﷺ ای النساء خير قال: الذی تسره اذا نظر وتطيعه اذا أمر و لا تخالفه فيما يكره فی نفسها وماله**)۔

مسند احمد، جلد ۲، صفحہ ۲۵۱

یہ حدیث اپنے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں کے لیے ہے۔ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے زندگی کے ساتھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں ایک دوسرے کے رازداں ہیں۔ زندگی کا کاروبار چلانے کے لیے وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ دونوں ایک

دوسرے کے لیے ایک گاڑی کے دو پہیئے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایسی حالت میں انسانیت کا تقاضا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سچے رفیق ثابت ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو خوش رکھنے کا اہتمام کریں۔ وہ ایک دوسرے کی رعایت کرنے والے ہوں۔ وہ غیر موجودگی میں بھی ایک دوسرے کے خیر خواہ بنے رہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے وہ کریں جو رفیقِ حیات کی حیثیت سے اُصولی طور پر اُنہیں ایک دوسرے کے لیے کرنا چاہیے۔

۷۔ عورت سرمایۂ حیات

عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی ہر چیز سامان ہے۔ اور دنیا کا سب سے اچھا سامان نیک عورت ہے (عن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : الدنيا كلها متاع، وخير متاع الدنيا المرأة الصالحة)

صحیح مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۲۷ (رقم الحدیث ۳۰۸۳)

عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے زندہ متاع یا زندہ سرمایۂ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گذارنے کے لیے عورت اور مرد دونوں کو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ شوہر اور بیوی کی صورت میں دونوں کو جو سرمایہ ملتا ہے وہ دوسری تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

یہ حقیقت اگر دونوں کے دل میں بیٹھ جائے تو عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرنے والے بن جائیں گے۔ دونوں یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ وہ ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کا تحمل نہیں کرسکتے۔ دونوں کا یہ خیال ہو جائے گا کہ انہوں نے اگر ایک دوسرے کی قدر نہ کی تو خود ان کی اپنی زندگی ہی بے معنٰی ہو کر رہ جائے گی۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح اپنی ضرورت سمجھیں گے جس کی تلافی کسی اور صورت میں ممکن نہیں۔

۸۔ سب سے بہتر خزانہ

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ

آدمی کے لیے بہتر جمع کرنے والا مال کیا ہے۔ نیک عورت کہ جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے۔ اور جب وہ اس کو حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔ اور جب وہ موجود نہ ہو تو وہ اس کی حفاظت کرے (**عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ألا اخبرک بخیر ما یکنز المرأ المرأة الصالحة اذا نظر الیها سرته واذا امرها اطاعته و اذا غاب عنها حفظته**)۔

سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ

اس حدیث میں عورت کی جو صفات بتائی گئی ہیں وہ کوئی سادہ صفات نہیں ہیں۔ اس حدیث کو پوری طرح اُس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ اُس کو اُس کے ظاہری الفاظ سے اوپر اُٹھ کر دیکھا جائے۔ جب کہ اُس کو زندگی کے زیادہ گہرے پہلوؤں کے ساتھ جوڑ کر سمجھا جائے۔

مرد کے لیے عورت صرف اس کی گھریلو ساتھی نہیں ہے بلکہ وہ اُس کے لیے سب سے بڑے خزانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کوئی ہو جو سوچنے کے عمل میں اُس کے ساتھ شیئر (share) کر سکے۔ جو پورے معنوں میں اس کا فکری رفیق (intellectual partner) بن جائے۔ عورت کسی مرد کی اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ وہ اُس کی ایک قابل اعتماد ذہنی رفیق ہے۔ کسی مرد کی بیوی ہی اس کی وہ ساتھی ہے جو اُس کو ہر صبح وشام حاصل رہتی ہے۔

مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی رفیقۂ حیات کو اس اعتبار سے تیار کرے۔ تعلیم وتربیت کے ذریعہ وہ عورت کو اس قابل بنائے کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنے شوہر کی ذہنی رفیق (intellectual partner) بن سکے۔ اس قسم کی ذہنی رفاقت کے جو فائدے ہیں اُنہی میں سے کچھ فائدوں کا ذکر علامتی طور پر مذکورہ حدیث میں کیا گیا ہے۔

۹۔ زندگی کی مددگار

ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قرآن میں جب یہ آیت اُتری کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع

کرتے ہیں اُن کے لیے وعید ہے تو بعض صحابہ نے کہا کہ اگر ہم یہ جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو لیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل چیز خدا کی یاد کرنے والی زبان ہے۔ اور خدا کا شکر کرنے والا دل ہے۔ اور مومن بیوی ہے جو اس کے ایمان پر اُس کی مدد کرے (**عن ثوبان قال لما نزلت (والذین یکنزون الذھب والفضۃ) کنا مع النبی ﷺ فی بعض اسفارہ فقال بعض اصحابہ نزلت فی الذھب والفضۃ لو علمنا ای المال خیر فنتخذہ۔ فقال افضلہ لسان ذاکر وقلب شاکر و زوجۃ مؤمنۃ تعنیہ علی ایمانہ۔**

احمد، الترمذی، ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۴۰۷ (رقم الحدیث ۲۲۷۷)

مادی دولت صرف دنیا کی عارضی زندگی میں کچھ راحت دے سکتی ہے۔ مگر ذکر اور شکر اور ایمان کی دولت وہ دولت ہے جو آخرت کی ابدی زندگی میں زیادہ بڑی راحت کا ذریعہ بنے گی۔ ذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا کو یاد کرے، اس کا ذہن خدا کی سوچ میں لگا رہے۔ شکر یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی نعمتوں کا گہرا احساس ہوجائے۔ وہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ خدا کے انعامات کا اعتراف کرنے لگے۔ ایمان سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی شعوری دریافت کے نتیجہ میں آدمی کے اندر جو عقیدہ بنتا ہے اُسی کا نام ایمان ہے۔

کسی مرد کے لیے عورت ان پہلوؤں سے سب سے بڑی مددگار ہے۔ مرد اور عورت اپنی روزانہ کی زندگی میں جب ایک دوسرے سے فکری تبادلہ (intellectual exchange) کرتے ہیں تو دونوں کو اس سے یہ فائدہ ملتا ہے کہ وہ خدا کی یاد کا گہرا روحانی تجربہ کرتے ہیں۔ وہ خدا کے عطیات کا تذکرہ کرکے ایک دوسرے کے اندر شکر کے جذبات کو بڑھاتے ہیں۔ وہ خدا کی ذات وصفات میں باہمی غور وفکر کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں دونوں کی معرفت (realization) میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ قابل اعتماد ساتھی

ابوامامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے تقویٰ کے بعد سب سے بہتر چیز جو ایک مومن پاتا ہے وہ نیک بیوی ہے۔ اگر وہ اس کو کوئی حکم دے تو

وہ اس کی اطاعت کرے۔ اور اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے اور اگر وہ اس پر قسم کھالے تو وہ اس کو پورا کرے اور اگر وہ اس سے غائب ہو تو وہ اپنے نفس اور اُس کے مال میں اس کی خیرخواہی کرے (**عن ابی امامة عن النبی ﷺ انه یقول: ما استفاد المؤمن بعد تقوی الله خیراً له من زوجة صالحة ان امرھا اطاعته و ان نظر الیھا سرّته و ان أقسم علیه ابرّته و ان غاب عنھا نصحته فی نفسھا و ماله**)۔

ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۳۰ (رقم الحدیث ۳۰۹۵)

یہ بات اپنے وسیع تر مفہوم میں عورت اور مرد دونوں کے اوپر منطبق ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین جوڑا اُسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ دونوں اپنے اندر مذکورہ صفات پیدا کرلیں۔

مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے تکملہ (complement) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنے وجود کو مکمل کرتا ہے۔ عورت کے بغیر مرد کی زندگی نامکمل ہے اور اسی طرح مرد کے بغیر عورت کی زندگی نامکمل ہے۔

عورت اور مرد دونوں اپنی زندگی کا یہ فریضہ صرف اس طرح ادا نہیں کرسکتے کہ وہ نکاح کرکے ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ اُنہیں ایک اور کام کرنا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اپنے شعور کو بیدار کریں۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے دونوں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کریں۔ دونوں کے لیے اُن کا گھر ایسا مدرسہ بن جائے جس میں شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے ٹیچر بھی ہوں اور اسی کے ساتھ ایک دوسرے کے اسٹوڈنٹ بھی۔ اس دوسرے پہلو سے دونوں کے درمیان رشتہ کی مضبوطی ان کی ازدواجی زندگی کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

حدیث کے یہ الفاظ بے حد اہم ہیں کہ وہ اس کے مال میں خیر خواہی کرے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہترین عورت وہ ہے جو گھر کی آمدنی کو صحیح طور پر خرچ کرے۔ وہ انتظام مال (money management) میں پوری طرح اپنے شوہر کی مددگار رہو۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مال دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے قیام کا ذریعہ ہے (النساء ۵) مال کا بہترین استعمال یہ ہے کہ اس کو حقیقی ضرورت کی مد میں خرچ کیا جائے۔ مال کے معاملہ میں فضول خرچی کرنا اتنا برا کام ہے کہ جو مرد اور عورت ایسا کریں ان کو قرآن میں شیطان کا بھائی اور بہن بتایا گیا ہے (الاسراء ۲۷)

مال کے معاملہ میں فضول خرچی کا تعلق عورتوں سے بہت زیادہ ہے۔ قرآن کے مطابق، عورت اپنے مزاج کے اعتبار سے تزئین اور نمائش جیسی چیزوں کو بہت زیادہ پسند کرتی ہے (الزخرف ۱۸) اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھروں میں تقریبات اور فرنیچر اور کپڑے اور دوسری مدوں میں مال کا جو غیر ضروری خرچ ہوتا ہے وہ زیادہ تر عورتوں کے ذوق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مال کا صحیح خرچ اور اس کا غلط خرچ دونوں کا انحصار زیادہ تر عورت کے اوپر ہوتا ہے۔

اس بات کو مثبت انداز میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کسی گھر کی کامیابی کا راز سادگی کلچر میں ہے، اور سادگی کلچر کا معاملہ تمام تر عورت کے اوپر منحصر ہوتا ہے۔ سادگی بظاہر ایک معمولی چیز ہے مگر عملی اعتبار سے دیکھیے تو وہ زندگی کی اہم ترین قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں سادگی ہوگی وہاں ہر دوسری چیز اپنے آپ موجود ہوگی۔ کسی نے بہتر زندگی کا فارمولا درست طور پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے — سادہ زندگی اور اونچی سوچ:

Simple living, high thinking

سادگی اور اونچی سوچ دونوں ایک دوسرے سے لازمی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں سادگی ہوگی وہاں اونچی سوچ ہوگی۔ اور جہاں اونچی سوچ ہوگی وہاں سادگی بھی ضرور پائی جائے گی۔ سادگی کا مطلب ہے، حقیقی ضرورت اور غیر حقیقی ضرورت میں فرق کرنا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ غیر حقیقی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ لینا اور اسی کے لیے مال خرچ کرنا ایک ایسی بری عادت ہے جو آدمی کے اندر ذہنی ارتقاء (intellectual development) کے عمل کو روک دیتی ہے۔ اس کے برعکس غیر حقیقی ضرورت کو نظر انداز کرنا اور صرف حقیقی ضرورت پر اپنا مال خرچ کرنا آدمی کو یہ

موقع دیتا ہے کہ وہ ذہنی ترقی کے عمل میں مصروف ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فضول خرچی اور اعلیٰ انسانیت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اعلیٰ انسانیت کے لیے سادہ زندگی ضروری ہے۔

کسی گھر کو سادگی کے اصول پر چلانا صرف عورت کا کام ہے۔ عورت اگر صرف یہی ایک کام کرے کہ مال کے حسن انتظام کے ذریعہ وہ گھر کے اندر سادگی کلچر کو رائج کر دے تو یہ اتنا بڑا کام ہوگا کہ اسی ایک کارنامہ کی بنا پر اس کو معمار انسانیت کا لقب دیا جا سکتا ہے۔

سادگی با اصول زندگی کی علامت ہے۔ اسی طرح انتظام مال (money management) منصوبہ بند زندگی کی علامت۔ جو لوگ ایسا کریں وہ گویا زندگی میں ترجیحات (priorities) کو جانتے ہیں۔ انہوں نے بے مقصد زندگی کا طریقہ چھوڑ کر با مقصد زندگی کے طریقہ کو اختیار کیا۔ انہوں نے حیوانی سطح کی زندگی سے اوپر اٹھ کر انسانی سطح کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دنیا میں بھی خدا کا انعام ملتا ہے اور آخرت میں بھی وہ خدا کے انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ حسنات دنیا کے بھی حصہ دار ہیں اور حسنات آخرت کے بھی حصہ دار۔

۱۱۔ زندگی کی عظیم نعمت

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں ہیں جن کو وہ دی گئیں تو اس کو دنیا اور آخرت کی تمام بھلائی دے دی گئی۔ شکر کرنے والا دل اور ذکر کرنے والی زبان اور مصیبتوں پر صبر کرنے والا بدن اور ایسی بیوی جس کے نفس اور اپنے مال میں اس کو کوئی ڈر نہ ہو (**عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال: اربع من أعطيهن فقد اعطى خير الدنيا والآخرة قلب شاكر ولسان ذاكر و بدن على البلاء صابر و زوجة لا تبغيه خوفا فى نفسها ولا ماله**)

البیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۷۶ (رقم الحدیث ۳۲۷۳)

ایسی بیوی جس کے نفس اور اپنے مال میں اس کو کوئی ڈر نہ ہو — اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی

بیوی جس کے اوپر آدمی کو پورا اعتماد ہو۔ یہ اعتماد ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ جب شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کو آخری حد تک اپنا سمجھ لیں تو اُس وقت دونوں کے درمیان غیریت کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ جیسے کہ دونوں کے درمیان ''میں اور وہ'' کا فرق مٹ گیا ہو۔ دونوں کی شخصیت ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک زندہ کُل بن گئی ہو۔

عورت اور بیوی کے درمیان اپنا پن کا یہی ماحول دونوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ جب دونوں کے درمیان اس طرح کا تعلق قائم ہو جائے تو دونوں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا میں وہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ گویا پوری انسانیت اُن کے ساتھ ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میرے باہر کا پورا عالم میرے ساتھ زندگی کے سفر میں شریک ہو گیا ہے۔ یہ احساس دونوں کے اندر اتنا زیادہ حوصلہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے بعد انہیں کوئی بھی چیز ناممکن نظر نہیں آتی۔

عورت کسی مرد کے لیے سب کچھ اُس وقت بنتی ہے جب کہ وہ محسوس کرے کہ مرد بھی اُس کے لیے اُس کا سب کچھ بن گیا ہے۔ باہمی اعتماد کا یہ معاملہ بلاشبہہ دوطرفہ ہے۔ فطری قوانین کے تحت یہ معاملہ یک طرفہ طور پر قائم نہیں ہو سکتا۔

۱۲۔ رعایت کا معاملہ

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کیوں کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھ اس کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو تو تم اس کو توڑ دو گے اور اگر تم اس کو چھوڑ دو تو وہ ویسی ہی رہے گی۔ پس تم عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو (**عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: استوصوا بالنساء خيراً فان المرأة خلقت من ضلع وانَّ اعوج شئ في الضلع اعلاه فان ذهبت تقيمه كسرته وان تركته لم يزل اعوج فاستوصوا بالنساء**)۔

صحیح البخاری، بحوالہ مشکوۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۶۷ (رقم الحدیث ۳۲۳۸)

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ خاتونِ اول حوّا کے طریقِ تخلیق کے بارہ میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ عورت کے عام مزاج کو بتاتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، پسلی کی ہڈی کسی قدر ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اس کا ٹیڑھا ہونا اس کا نقص نہیں ہے بلکہ یہی اس کی موزونیت ہے۔ پسلی کی ہڈی کو اگر آپریشن کرکے سیدھا کردیا جائے تو وہ جسم انسانی میں اپنی کارکردگی کو صحیح طور پر ادا نہ کرسکے گی۔

ایک اور روایت میں یہ لفظ ہے کہ **المرأة کا لضلع** (عورت پسلی کی ہڈّی کی مانند ہے)۔ یہ تمثیل کی زبان ہے۔ اور یہ تمثیل دراصل عورت کی ایک صفت کو بتانے کے لیے ہے۔ اور وہ یہ کہ عورت نسبتاً جذباتی (emotional) ہوتی ہے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت کو کسی قدر جذباتی اس لیے بنایا گیا ہے کہ چیزوں سے اس کو ایک جذباتی تعلق ہو جائے اور اس بنا پر وہ اپنی مخصوص ذمہ داریوں کو بہتر طور پر ادا کرسکے۔ اسی مخصوص مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ عورت کو اپنے بچّہ کے ساتھ انتہائی جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ اگر یہ جذباتی تعلق نہ ہو تو عورت اپنے بچہ کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرسکے۔

۱۳۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے خوشبو اور عورتیں محبوب بنائی گئی ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے **(حبب الی من دنیاکم الطیب والنساء وجعلت قرة عینی فی الصلوٰة)**

احمد، النسائی، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۳، صفحہ ۱۴۴۸ (رقم الحدیث ۵۲۶۱)

اس حدیث میں ضمیر متکلم کے اسلوب میں دراصل انسانی فطرت کو بتایا گیا ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ مزاج ہے کہ وہ اپنے زوج (جوڑے) کی طرف خصوصی میلان رکھتا ہے۔ وہ اپنے جوڑے کو اپنا تکمیلی حصہ سمجھتا ہے۔ اس کا پورا وجود محسوس کرتا ہے کہ اس جوڑے کے بغیر اُس کی ہستی مکمل نہیں۔ یہ فطرت کی تخلیق کا ایک حصہ ہے۔ اس کا تعلق ہر انسان سے ہے۔

مرد اور عورت دونوں کو مل کر دنیا میں جو کام کرنا ہے وہ بے حد صبر آزما کام ہے۔ وہ ایک پُرمشقت جدوجہد ہے۔ اس پُرمشقت جدوجہد کو خوشگوار بنانے کے لیے عورت اور مرد کے اندر ایک

دوسرے کے لیے محبت رکھ دی گئی ہے۔ یہی الفت اور محبت کسی انسانی سماج کو مستحکم سماج بناتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں الفت اور محبت کی حقیقت چپکانے والے مادہ (adhesive) کی ہے۔ اگر یہ الفت اور محبت ختم ہو جائے تو خاندان اور سماج دونوں انتشار کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

۱۴۔ سب سے افضل متاع

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں (اتقوا اللہ فی النساء لیس من متاعِ الدنیا شئ افضل من المرأة الصالحة)

سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح

مرد اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک ادھوری شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ عورت کے ساتھ مل کر اُس کی شخصیت مکمل ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خود عورت کا بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر عورت اور ہر مرد خود اپنے تجربہ کے ذریعہ سمجھ سکتا ہے۔

اس اعتبار سے عورت اور مرد کی باہمی رفاقت زندگی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ مگر اس رفاقت کو نباہنے کے لیے کوئی مجبورانہ بندھن موجود نہیں۔ یہی وہ پہلو ہے جو دونوں کے درمیان باہمی رفاقت کو نباہنے کے لیے خدا کے خوف کو ضروری بنا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس رفاقت کی کامیابی کے لیے ضرورت ہے کہ دونوں کے اندر اُس کی اُصولی اہمیت کا شعور زندہ ہو۔ خدا کا خوف اسی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اور پھر یہ شعور اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ غیر موافق اسباب کے باوجود دونوں کے درمیان رفاقت کا تعلق کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔

۱۵۔ عورت ماں کی حیثیت سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جان لو، جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ (الجنة تحت اقدام الامهات)

عورت ماں کی حیثیت سے اپنی اولاد کی سب سے بڑی محسن ہوتی ہے۔اس اعتبار سے انسان کے اوپر ماں کا درجہ سب سے زیادہ ہے۔اس حدیث میں دراصل اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ محسن کے احسان کا اعتراف سب سے بڑی نیکی (virtue) ہے۔اس نیکی کی اسپرٹ جس کے اندر ہو اُس کے اندر بیک وقت دو صفتیں موجود ہوں گی—انسان کی نسبت سے اُس کے حسنِ سلوک کا گہرا اعتراف اور خدا کی نسبت سے اُس کے احسان کا گہرا شکر۔یہی صفت کسی انسان کے لیے جنت میں داخلہ کا سب سے بڑا استحقاق ہے۔

۱۶۔ لڑکیوں کی تربیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے تین لڑکیوں کی پرورش کی۔ پھر ان کو ادب سکھایا اور اُن کی شادی کی اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے (**من عال ثلاث بنات فادبهن و زوجهن و احسن اليهن فله الجنة**)

سنن ابی داؤد، کتاب الادب

عام مزاج یہ ہے کہ اگر کسی باپ کے یہاں کئی لڑکیاں ہوں اور کوئی لڑکا نہ ہو تو وہ لڑکیوں کو بے قدر کر دیتا ہے۔اس حدیث میں اسی ذہن کی تردید کی گئی ہے۔کسی باپ کے یہاں لڑکا پیدا ہو یا لڑکی، دونوں حالتوں میں باپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دے۔وہ اُن کو ایسی تربیت دے جو اُن کے لیے زندگی گذارنے میں مددگار بنے۔

باپ کا رجحان اکثر اپنی اولاد کے لیے یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن کے لیے زندگی کی راحتیں فراہم کرے۔وہ کما کر اُنھیں زیادہ سے زیادہ مال دے سکے۔مگر یہ نظریہ درست نہیں۔اولاد کے لیے باپ کا سب سے بہتر عطیہ مال نہیں ہے بلکہ تعلیم ہے۔باپ کا کمایا ہوا مال اولاد کے لیے بلا محنت کی کمائی (easy money) کی حیثیت رکھتا ہے۔ایسا مال اکثر آدمی کو خراب کر دیتا ہے۔صحیح یہ ہے کہ آدمی اپنی اولاد کو تعلیم دے۔اور اس طرح اُنھیں اس قابل بنائے کہ وہ خود محنت کر کے زیادہ بہتر طور پر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

۱۷۔ لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے یہاں لڑکی ہو۔ پھر وہ نہ اُس کو زمین میں گاڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے اور نہ اُس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اُس کو جنت میں داخل کرے گا۔(**من کانت له انثیٰ فلم یئدها ولم یهنها و لم یوثر ولده علیها (یعنی الذکور) ادخله الله الجنة**)۔

سنن ابی داؤد، کتاب الأدب

حسن سلوک ایک ایسی نیکی ہے جو ہر مرد اور عورت کے ساتھ مطلوب ہے۔ مگر لڑکیوں کے سلسلہ میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ غریب طبقہ کے لوگ لڑکیوں کو اپنے اوپر بوجھ سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اُن کے معاملہ میں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی طور پر ادا نہیں کر پاتے۔ دولت مند طبقہ اپنے مخصوص لائف اسٹائل کی بنا پر خود اپنے لیے زندگی کی خوشیوں کو تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اس آزادی کے نتیجہ میں لڑکیاں اپنی ابتدائی عمر ہی میں تباہ کن غلطیوں کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ایسی حالت میں لڑکیاں اپنے سرپرستوں کے لیے نازک ذمہ داری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنا اسلام کی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر کوئی شخص اپنے رب کے یہاں بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

۱۸۔ بے سہارا لڑکیوں کی خدمت

سراقہ بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ افضل صدقہ کیا ہے۔ تمہاری لڑکی جو (بیوگی یا طلاق کی وجہ سے) تمہاری طرف لوٹا دی جائے۔ تمہارے سوا کوئی اس کے لیے کمانے والا نہ ہو (**عن سراقة بن مالك ان النبی ﷺ قال: الا ادلكم علی افضل الصدقة ابنتك مردودة الیك لیس لها كاسب غیرك**)

سنن ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۳، صفحہ ۱۳۹۳ (رقم الحدیث ۵۰۰۲)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت طلاق کی وجہ سے یا بیوہ ہو جانے کی وجہ سے اپنے سسرال میں نہیں رہ سکتی اور وہاں سے واپس ہوکر اپنے باپ کے پاس آجاتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسی عورت سماج میں بے سہارا بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا بے سہارا ہونا اس کے والدین کے لیے اخلاقی خدمت کا ایک اعلیٰ موقع عطا کرتا ہے۔ اگر اس کے والدین ایسی خاتون کو دوبارہ قبول کرلیں، اُس کے لیے نئی زندگی کے مواقع تلاش کریں، اُس کو پھر سے سماج کا ایک باعزت ممبر بنانے کی کوشش کریں، اُس کو ازسرِ نو ایک کامیاب زندگی گذارنے کے قابل بنائیں تو اُن کا یہ عمل خدا کے یہاں ایک عظیم عمل شمار کیا جائے گا اور وہ اپنے اس عمل کی بنا پر آخرت کی دنیا میں خدا کے عظیم تر انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

۱۹۔ نجات کا ذریعہ

عائشہ صدیقہ کی ایک طویل روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جس شخص کو لڑکیوں کے ذریعہ کچھ آزمائے پھر وہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ اس کے لیے آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی (من ابتلی من البنات بشئ فأحسن الیھن کن له سترا من النّار)
فتح الباری لابن حجر العسقلانی، جلد ۳، صفحہ ۴ ۳۳ (رقم الحدیث ۱۴۱۸)

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی سبب سے ایک لڑکی اپنے والدین کے لیے سرمایہ (asset) کے بجائے بوجھ (liability) محسوس ہونے لگتی ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم کے مطابق، ایسی لڑکی اپنے ماں باپ کے لیے ایک اور پہلو سے بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ والدین کے لیے آخرت کے زیادہ بڑے انعامات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

تاہم یہ بات اتنی سادہ نہیں۔ یہ دراصل عُسر میں یسر کی ایک صورت ہے۔ والدین اگر ایسی لڑکی کے لیے اچھی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں اور اُس کو زندگی کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل بنائیں تو عین ممکن ہے کہ وہ لڑکی تیار ہوکر اپنے خاندان کے لیے ایک نعمت بن جائے۔ اُس کے ذریعہ سے خاندان میں مثبت طرزِ فکر پروان چڑھے۔ اُس کے ذریعہ سے گھر میں تعمیری ماحول پیدا ہو۔ وہ

لڑکی اپنے خاندان کی ایک صحت مند ممبر بن کر خاندان کی ترقی کا ذریعہ بنے۔

اس قسم کا کام ابتدائی طور پر اگرچہ اخروی انعام کے جذبہ کے تحت شروع کیا جاتا ہے مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ خود دنیا کی تعمیر کا بہترین ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خاندان کے لیے مفید ہوتا ہے، دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا کے اعتبار سے بھی۔

۲۰۔ عورتوں سے مشورہ

حسن بصری تابعی نے سترّ سے زیادہ صحابہ کو دیکھا تھا اور اُن سے سُنا تھا۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ آپ کا طریقہ تھا کہ آپ کثرت سے مشورہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ عورت سے بھی مشورہ کرتے تھے، اور عورت کبھی ایسی رائے دیتی تھی جس کو آپ قبول کر لیتے تھے (**كان النبى ﷺ يستشير حتى المرأةَ فتشير عليه بالتى فياخذ به**)۔

عیون الاخبار لابن قتیبۃ، جزء ۱، صفحہ ۲۷

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ اُسوہ محدود معنوں میں نہیں ہے۔ وہ وسیع معنوں میں ہے۔ اُس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ کسی کو مشیر کا درجہ دینا اس کو ایک باعزت درجہ دینا ہے۔ ایسی حالت میں عورت کو مشیر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی تعلیم وتربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ معاملات میں مشورہ دینے کے قابل ہو سکے۔ مشورہ لینے میں مشورہ دینے کے قابل بنانا اپنے آپ شامل ہے۔ سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو کوئی عورت (یا مرد) اپنے آپ مشیر نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی تعلیم وتربیت اُس کے مطابق ہو۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام کا مذکورہ اُسوہ اپنے اندر ایک مکمل تصور حیات لیے ہوئے ہے۔ اُس کے اندر سماج کا ایک ایسا نقشہ نظر آتا ہے جس میں تعلیم وتربیت کے اعتبار سے ایسی سرگرمیاں جاری ہوں جو عورتوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ سماج کا ایک صحت مند حصہ بن سکیں۔ وہ اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس قابل ہوں کہ معاملات میں صحیح مشورہ دیں۔ وہ کسی معاملہ میں بحث وتبادلہ (discussion) کے وقت اپنا مفید کردار ادا کر سکیں۔

سوچنے کا طریقہ

ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) کے شمارہ اپریل ۲۰۰۴ میں ایک رپورٹ چھپی ہے جس کا عنوان یہ ہے: ''ادارہ الفرقان کی زندگی کا ایک یادگار دن''۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۲۷ فروری ۲۰۰۴ کو ندوہ (لکھنؤ) کے شبلی ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں علماء اور طلباء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہ جلسہ مولانا محمد منظور نعمانی کے درس قرآن کی اشاعت کے سلسلہ میں تشکر اور تعارف کے موضوع پر ہوا تھا۔

اس جلسہ کے صدر مولانا سید رابع حسنی ندوی تھے۔ اس روداد کے مرتب مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ہیں۔ اس جلسہ کے موقع پر شبلی ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ اس میں مختلف علماء نے تقریریں کیں۔ ان مقررین میں سے ایک ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی تھے۔ وہ دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک ان کا ذاتی مشاہدہ تھا۔ ان کی تقریر کے اس حصہ کو الفرقان سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے، مولانا محمد منظور نعمانی کے طرز کلام کی خصوصیات اور ان کی تقریروں کا جو غیر معمولی اثر سننے والوں پر پڑا کرتا تھا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۹۵۳ میں بستی کے ایک اجلاس میں جس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم خواص بھی مدعو کیے گئے تھے، توحید کے موضوع پر ان کی ایک تقریر کا ذکر، بطور مثال کیا اور کہا کہ اس تقریر کے سننے والوں میں انٹر کالج میں ہندی کے ایک لکچرر جناب گنیش پرشاد سریواستوا صاحب بھی تھے۔ رات میں تقریر سن کر وہ چلے گئے اور رات بھر روتے رہے۔ دوسرے دن صبح کو ایک مخصوص نشست رکھی گئی تھی اس میں بھی وہ آئے۔ مولانا نعمانی کی ان پر نظر پڑی۔ مولانا نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں میں تعارف ہوا اور پھر ہم لوگوں نے دیکھا کہ گنیش پرشاد سریواستوا اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے، وہ زار وقطار رونے لگے۔ ہم نے اُنھیں یہ کہتے ہوئے سُنا کہ مولانا! جس طرح کی تقریر آپ نے توحید کے موضوع پر کی ہے۔ اگر اس کا سلسلہ ہندستان میں شروع ہو جائے

تو کم از کم ہم جیسے لوگ تو اسلام سے بہت قریب آجائیں گے۔ بعد میں بستی میں یہ بھی مشہور ہوا کہ عمر کے آخری حصے میں انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، واللہ اعلم۔ بہرحال عجیب وغریب اثر رکھا تھا اللہ نے مولانا محمد منظور نعمانی کی تقریر اور تحریر میں۔'' (صفحہ ۱۵)

مذکورہ واقعہ پچاس سال سے بھی زیادہ پہلے ۱۹۵۳ میں پیش آیا۔ یہ واقعہ ہندستان میں عظیم دعوتی امکان کو بتا رہا تھا۔ اس اعتبار سے اس میں علماء کے لیے یہ اہم رہنمائی موجود تھی کہ اس ملک میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اُس وقت ملک میں بڑے بڑے علماء موجود تھے مگر اس پہلو سے کچھ بھی نہ کیا جاسکا۔ اس کا سبب سوچنے کا ایک غلط طریقہ تھا۔ جیسا کہ اقتباس سے واضح ہے، لوگوں نے اس واقعہ کو صرف مقرر کی شخصی تعریف کے معنٰی میں لیا۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہوگئے کہ ہمارے فلاں عالم عجیب وغریب قسم کی تقریر کرتے ہیں۔ اُن کی تقریر میں سحر انگیز اثر پایا جاتا ہے۔

اس معاملہ میں سوچنے کا دوسرا زیادہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ اُس کو دعوتی امکان کے پہلو سے لیا جاتا۔ یعنی یہ کہ اس ملک میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو دین حق کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر اُس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے بعد ہندستان کے بڑے بڑے علماء کا ایک جلسہ کسی مرکزی شہر میں کیا جاتا۔ اس جلسہ میں یہ بتایا جاتا کہ واقعات کی روشنی میں ضروری ہوگیا ہے کہ ہندستان میں دینی کام کے لیے ہم اپنے پورے نقشہ کو بدل دیں۔ اب یہاں کام کا نیا منصوبہ بنایا جائے۔

اس جلسہ میں بتایا جاتا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرو، اس کے بعد ہی دوسروں میں دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے، ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اعلان کریں کہ ہم غلطی پر تھے۔ مسلمانوں کی موجودہ اخلاقی حالت ہی میں یہاں دعوت کے غیر معمولی امکانات موجود ہیں جن کو ہمیں استعمال کرنا چاہیے۔ اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پہلے مکمل اسلامی نظام قائم کرکے دکھاؤ، اس کے بعد ہی دوسرے لوگ اسلام کی طرف راغب ہوں گے، ایسے لوگوں کی سوچ بھی سرتاسر غلط ہے۔ کیوں کہ واقعات بتاتے ہیں کہ ''مکمل اسلامی نظام'' کے نفاذ سے پہلے ہی خدا کے بندے اسلام کو اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس ملک کا اکثریتی طبقہ اسلام کا دشمن بن چکا ہے، وہ

ہمارا حریف ہے، نہ کہ مدعو، ایسے لوگوں کو بھی کھلے طور پر ماننا چاہیے کہ یہ سوچ بالکل غلط تھی۔ اس ملک کے اکثریتی فرقے کے اندر آج بھی اسلام کے لیے نرم گوشہ موجود ہے جس کو ہم حکمت کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ہندستان میں بہت سے مسلمان ہیں جو آزادی (۱۹۴۷) کے بعد طرح طرح کے ناموں سے جزئی مقاصد کے لیے جماعتیں اور تنظیمیں بنائے ہوئے ہیں۔ ان سب کو کھلے طور پر یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہماری سوچ درست نہ تھی۔ اسلام کا سب سے بڑا کام دعوتی کام ہے۔ اور جب دعوتی کام کے روشن امکانات موجود ہوں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر اپنی ساری طاقت دعوت کے محاذ پر لگا دی جائے۔

اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کا جان و مال محفوظ نہیں، ان کی دینی اور ملّی شناخت کو مٹایا جا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی یہ کھلا اعلان کرنا چاہیے کہ مفروضہ یا غیر مفروضہ خطرہ کے باوجود اس ملک میں اسلام پوری طرح محفوظ ہے اور ہمارے لیے یہ امکان موجود ہے کہ ہم اسلام کے پیغام کو لے کر آگے بڑھیں اور پھر یقینی طور پر یہاں وہ منظر دکھائی دے گا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **فاذا الذی بینك و بینه عداوة كانه ولي حميم۔**

مگر عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ان میں سے کوئی بھی کام نہ ہو سکا۔ کسی اعلان کرنے والے نے اس قسم کا اعلان نہیں کیا۔ ۱۹۵۳ کے بعد سے اب تک سینکڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کے بڑے بڑے جلسے ہوئے۔ ان جلسوں میں پُر جوش الفاظ میں یہ کہا گیا کہ اس ملک میں اسلام خطرہ میں ہے۔ مگر کسی بھی جلسہ میں مسلم رہنماؤں نے یہ زیادہ اہم بات نہیں بتائی کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں اسلام پیش قدمی کی پوزیشن میں ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے باشندے اس فارسی شعر کا مصداق ہیں:

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ بر کف — بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

یہ فرق کیوں ہوا۔ یہ سوچ میں فرق کا نتیجہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ سوچنے کے دو طریقے بالکل الگ

الگ ہیں۔ ایک ہے، فخر کے جذبہ کے تحت سوچنا اور دوسرا ہے، دعوت کے جذبہ کے تحت سوچنا۔ فخر کے جذبہ کے تحت سوچنے والوں کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنی محبوب شخصیت کا کمال بتا کر مطمئن ہوجائیں اور اس کو بیان کرکے اپنے آپ کو خوش کرتے رہیں۔

سوچ کا دوسرا طریقہ وہ ہے جو دعوتی مقصد پر مبنی ہو۔ ایسے لوگ اس قسم کے معاملہ کو دعوتی امکان کے روپ میں لیں گے۔ وہ اس میں اپنے لیے مستقبل کا نقشۂ کار دریافت کرلیں گے۔ اُن کی سوچ اُنہیں یہ بتائے گی کہ جب زیادہ دوررس کام کے مواقع ہوں تو چھوٹے چھوٹے کاموں میں وقت ضائع کرنا نادانی ہے۔ جب اسلام دلوں کو فتح کرنے کی پوزیشن میں ہوتو چھوٹی چھوٹی شکایتوں کو لے کر احتجاجی مہم چلانا صرف دیوانگی ہے۔ جب دین اسلام کے لیے نیا مستقبل پیدا کرنے کا موقع ہوتو شخصی کمال کو لے کر خوش ہونا اس شعر کا مصداق ہے کہ:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا　　　ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

ماہنامہ جام نور دہلی کا سوالنامہ برائے جہاد نمبر

۱۔ قرآن واحادیث کی روشنی میں نظریۂ جہاد کی وضاحت فرمائیں۔

۲۔ مختلف ملکوں میں جو تنظیمیں جہاد کے نام پر جدوجہد کررہی ہیں ان سے جزوی یا کلّی طور پر آپ کہاں تک متفق ہیں۔

۳۔ جہادی جدوجہد کے تحت عام شہریوں کو جو نشانہ بنایا جارہاہے کیا یہ عمل اسلامی نظریۂ جہاد سے ہم آہنگ ہے۔

۴۔ کیا جہاد کے نام پر اسلام خودکش حملے کی اجازت دیتا ہے۔

۵۔ استعماری قوت سے اپنی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت کے تحفظ یا مسلم ممالک کے قدرتی وسائل کو استحصال سے بچانے کے لیے یا باطل قوتوں کی ناانصافیوں اور ظلم وتغلّب کے خلاف جو تنظیمیں جہاد کے نام پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں ان کے نتائج اب تک کتنے مثبت اور کتنے منفی ہوئے۔

۶۔ جن مقاصد کے حصول وتحفظ کے لیے جہادی تنظیموں نے جو طریقے اپنائے، کیا ان مقاصد کے حصول کے لیے یہی ایک راہ ہے۔ یا دوسرے طریقے بھی اپنائے جاسکتے ہیں۔

۷۔ حکم جہاد کے نفاد اور اس کو عملی طور پر شروع کرنے کے لیے کسی امام، خلیفہ یا قائد کے تعین کا اسلامی طریقہ کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔

۸۔ جہاد کو غلط طور پر پیش کر کے مسلمانوں کے خلاف عالمی پیمانے پر جو سازشیں رچی جارہی ہیں اور ان پر ہر طرح کے ظلم اور ناانصافی کو روا رکھا جارہا ہے اس کا دفاع کس طرح ممکن ہے۔

۹۔ مستشرقین اور یورپ کے منصوبہ سازوں نے اسلام کے پاکیزہ نظریۂ جہاد کے خلاف امت مسلمہ کے دانشوروں اور نئی نسلوں کو ذہنی طور پر جو متاثر کیا ہے اس کی صفائی کس طرح ہوسکتی ہے۔

۱۰۔ اگر کسی جگہ اپنی شرائط کے پیش نظر جہاد صحیح ہو تو اس کے نفاذ کی ذمہ داری عوام پر عائد

ہوتی ہے یا اسلامی مملکتوں کے سربراہوں پر۔ اگر جہاد کے نام پر شروع کی گئی سرگرمیاں صحیح نہ ہوں تو مملکتوں کے سربراہوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

۱۱۔ سماجی سطح پر ہندستان میں مدارس اسلامیہ کا فکری رجحان کیا رہا ہے۔

۱۲۔ اب تک ہندستان کے مدارس میں دہشت گردی کی فکری یا عملی تعلیمات کا کوئی ثبوت نہ ملنے کے باوجود ملکی سطح پر کچھ حلقے سے مدارس اسلامیہ پر مسلسل دہشت گردی کے فروغ کے الزامات عائد کیے جارہے ہیں، آخر اس کے اسباب وعوامل کیا ہوسکتے ہیں اور اس ڈھٹائی کے پیچھے ان کے کیا مقاصد پنہاں ہیں۔

۱۳۔ مدارس اسلامیہ کو اپنے وقار کے تحفظ اور ان سازشوں کے نتائج سے بچنے کے لیے کیا کرنا چاہئے۔

جوابات

۱۔ قرآن اور حدیث میں جہاد کا لفظ اصلاً پرامن جدوجہد کے لیے آیا ہے۔ جہاں تک مسلّح جنگ کا تعلق ہے، اس کے لیے قرآن اور حدیث میں قتال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جہاد کا لفظ اگر کہیں جنگ کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے تو وہ اس لفظ کا ایک توسیعی مفہوم ہے، نہ کہ اس کا اصل مفہوم۔

۲۔ غیر حکومتی تنظیموں کی طرف سے جہاد (بمعنٰی قتال) کا عمل جو آج کل مختلف مسلم گروہوں کی طرف سے جاری ہے وہ بلاشبہہ غیر اسلامی ہے۔ یہ سب جہاد کے نام پر فساد کا عمل ہے۔ کیوں کہ جہاد (بمعنٰی قتال) سرتاسر حکومت کی ذمّہ داری ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں کے لیے پرامن دعوت ہے نہ کہ مسلّح جہاد۔

۳۔ عام شہریوں کو تشدد کا نشانہ بنانا کسی حال میں جائز نہیں، حتیٰ کہ کسی مسلم حکومت کے تحت ہونے والے جائز جہاد میں بھی نہیں۔ جائز جہاد میں بھی صرف مقاتل پر وار کیا جاسکتا ہے، غیر مقاتل پر وار کرنے کی گنجائش اسلام کے اصولِ جنگ میں نہیں ہے۔

۴۔ خودکشی یا خودکش حملہ کرنا یقینی طور پر حرام ہے۔ جہاد کا نام دینے سے کوئی حرام کبھی حلال نہیں

ہوسکتا۔ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مجاہدین مختلف مقامات پر جو خودکش بمباری (suicide bombing) کررہے ہیں وہ بلاشبہہ حرام ہے۔ خودکشی کسی بھی عذر کی بنا پر اسلام میں جائز نہیں۔ مزید یہ کہ یہ خودکش بمباری عام طور پر غیر مقاتلین (non-combatants) کے اوپر کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سافٹ ٹارگٹ (soft target) سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دوسرا پہلو اس حرمت کو اور بھی زیادہ سنگین بنا دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اسلام کی جو بدنامی ہورہی ہے وہ تمام نقصانات میں سب سے زیادہ بڑا نقصان ہے۔

۵۔ پانچویں سوال میں جن مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی بھی مقصد کے لیے غیر حکومتی تنظیموں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مفروضہ دشمن کے خلاف مسلّح جہاد چھیڑ دیں۔ ان مقاصد کے نام پر موجودہ زمانہ میں جو مسلّح جہاد کیا گیا وہ ایک غیر اسلامی فعل تھا یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کی نصرت حاصل نہ کرسکا۔ اور اس بنا پر وہ اپنے مقصد کے حصول میں مکمل طور پر ناکام رہا۔

٦۔ چھٹے سوال میں جن مقاصد کا ذکر ہے ان کے حصول کی تدبیر صرف ایک ہے اور وہ پرامن جدوجہد ہے۔ تشدد پر مبنی جدوجہد کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں، جیسا کہ عملاً پیش آیا۔

ان مقاصد کے لیے موجودہ زمانہ میں جو کوششیں کی گئی ہیں وہ زیادہ تر جہاد یا ٹکراؤ کے اصول پر مبنی ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے جذبات کے ساتھ خارجی حالات کا بے لاگ جائزہ لیں۔ خارجی حالات کی رعایت کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہماری کوشش کامیاب ہوسکے۔ موجودہ قسم کی جہادی سرگرمیوں میں یہ خارجی رعایت مفقود ہے۔ جب تک یہ صورت حال باقی رہے گی، ہماری کوششیں ناکامی کے سوا کسی اور انجام تک نہیں پہنچ سکتیں۔

جہاد دراصل ایک پرامن جدوجہد ہے جو گہری منصوبہ بندی کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ جہاد کی عملی طور پر دو قسمیں ہوسکتی ہیں۔ ایک ہے، کھوئے ہوئے پر جہاد اور دوسرا ہے، ملے ہوئے پر جہاد۔ میرے

مطالعہ کے مطابق، موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کے درمیان جہاد کے نام پر بے شمار ہنگامے جاری رہے۔ مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جہاد کے نام پر کی جانے والی یہ تمام سرگرمیاں کھوئے ہوئے پر جہاد کے ہم معنٰی تھیں نہ کہ ملے ہوئے پر جہاد کے ہم معنٰی۔

امیر کابل کے تعاون سے شاہ ولی اللہ کا جہاد، سلطان ٹیپو کا جہاد، شہیدین کا جہاد، علماء دیوبند کا جہاد، علی برادران کا احیاء خلافت کے نام پر جہاد۔ قیام پاکستان کے لیے جہاد، آر ایس ایس کے خلاف جہاد، بابری مسجد کے لیے جہاد، وغیرہ وغیرہ، سب کے سب کھوئے ہوئے پر جہاد کی صورتیں ہیں۔ اس لیے یہ تمام جہادی قربانیاں حبط اعمال کا شکار ہو گئیں۔

یہی معاملہ دیگر مقامات پر کیے جانے والے جہاد کا ہے۔ مثلاً فلسطین کا جہاد، بوسنیا کا جہاد، چیچنیا کا جہاد، فلپائن کا جہاد، اراکان کا جہاد، کشمیر کا جہاد وغیرہ، سب کے سب کھوئے ہوئے پر جہاد کے ہم معنٰی تھا۔ اس لیے امت کو ان کے ذریعہ تباہی کے سوا کچھ اور حاصل نہیں ہوا۔ میرے علم کے مطابق، اس پوری مدت میں پوری مسلم دنیا میں جہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل ایسا نہیں جس کو ملے ہوئے پر جہاد کا نام دیا جاسکے۔

اس معاملہ میں اب اصل ضرورت پورے معاملہ پر نظر ثانی (reassessment) کی ہے، نہ یہ کہ اپنی ناکامی کو دوسروں کے خانہ میں ڈال کر مفروضہ دشمنوں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم چلائی جائے۔ زندگی کی ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنی غلطی کی قیمت خود بھگتنی پڑتی ہے، ایک کی غلطی کی قیمت کوئی دوسرا شخص کبھی بھگتنے والا نہیں۔ یہ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی الف ب ہے، اور عجیب بات ہے کہ ساری مسلم دنیا کے مسلم رہنماؤں میں غالباً کوئی ایک شخص نہیں جو اس حقیقت کو شعوری طور پر جانتا ہو، خواہ وہ عربی داں مسلمان ہو یا انگریزی داں مسلمان۔

۷۔ اسلام میں جہاد (بمعنٰی قتال) کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ برائے دفاع ہے۔ دفاع کے سوا کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے جنگ چھیڑنا اسلام میں جائز نہیں۔ اور دفاع کی یہ جنگ اعلان کی لازمی شرط کے ساتھ صرف ایک قائم شدہ مسلم حکومت ہی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام

میں گوریلا جنگ، پراکسی جنگ، جارحانہ جنگ، بلا اعلان جنگ سب ناجائز ہیں۔

۸۔ آٹھویں سوال کے بارے میں میں کہوں گا کہ اس کے دفاع کی صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان خود اپنی طرف سے ان تمام پرتشدد سرگرمیوں کو یکسر بند کر دیں جو موجودہ زمانہ میں جہاد کے نام پر چل رہی ہیں۔ مذکورہ مسئلہ صرف مسلمانوں کے خودساختہ جہاد کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس خودساختہ جہاد کے ختم ہوتے ہی مذکورہ مسئلہ بھی اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

۹۔ اسلام کے پاکیزہ نظریہ جہاد کو داغ دار کرنے والے خود مسلمان ہیں۔ یہ دراصل مسلمان ہیں جنھوں نے اسلامی جہاد کی تصویر کو اپنی غلط روش سے بگاڑا ہے۔ اس مسئلہ کا حل بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنی غلط روش کو بند کر دیں۔ اس کے بعد دوسروں کو کسی سازش کا موقع ہی نہ ملے گا۔

۱۰۔ میرے نزدیک موجودہ زمانہ میں کسی بھی مقام پر جہاد (بمعنٰی قتال) کی شرائط پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ اور اگر بالفرض کسی مقام پر یہ شرائط پوری ہو رہی ہوں تب بھی غیر حکومتی تنظیموں کے لیے جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں۔ کسی کے نزدیک اگر مسلم حکومتیں اپنا فرض پورا نہ کر رہی ہوں تب بھی اس عذر کو لے کر کسی کے لیے بطور خود جہاد چھیڑ دینا جائز نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں عام مسلمانوں کے لیے صبر ہے نہ کہ خود سے جنگ چھیڑنا۔

قرآن کے مطابق، جہاد وہ ہے جو فی سبیل اللہ ہو۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمان جو جہاد کر رہے ہیں وہ سب کا سب فی سبیل القوم ہے۔ وہ منفی جذبہ کے تحت کیا جانے والا عمل ہے نہ کہ مثبت جذبہ کے تحت کیا جانے والا عمل۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ جہاد نہیں ہے بلکہ فساد ہے۔

۱۱۔ سماجی مسائل کے بارے میں مدارس اسلامیہ کا بظاہر کوئی فکری رول براہ راست طور پر نہیں ہے۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ مدارس اسلامیہ کے سامنے شعوری طور پر سماجی فلاح کا کوئی نقشہ موجود تھا۔ تاہم اس سلسلہ میں بالواسطہ طور پر ان کی خدمات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فتاویٰ کے ذریعہ رہنمائی۔ مساجد میں خطباتِ جمعہ، عوامی جلسہ میں خطاب، مختلف تقریبات کے دوران اساتذہ اور طلبہ کا عوام سے انٹرایکشن، شادی بیاہ جیسی رسموں میں شرکت کے دوران وعظ و نصیحت اور رسالوں

کے ذریعہ تعلیم ونصیحت، وغیرہ۔ سماجی اعتبار سے ایک مستقل کام سوشل سروس ہے۔ مگر مدارس میں غالباً سوشل سروس کا کوئی باقاعدہ تصور موجود نہیں۔

۱۲۔ یہ صحیح ہے کہ مدارس میں دہشت گردی کی تعلیم وتربیت نہیں دی جاتی۔ اس اعتبار سے مدارس پر الزام لگانا غلط ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ صحیح ہے کہ مدارس کے نظام میں عین وہی ذہن بنتا ہے جس کو جہادی ذہن کہا جاتا ہے۔ مدارس کے لوگوں کو امت مسلمہ کے مسائل کے سلسلہ میں پر امن عمل کا کوئی شعور نہیں۔ وہ دور جدید کے اس امکان سے بے خبر ہیں کہ ہر میدان میں حصہ داری (sharing) کے اصول پر کام کیا جانا چاہیے۔ مدارس کے لوگ اب تک شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ غیر مسلم لوگ کافر ہیں۔ غیر مسلم ممالک دار الکفر یا دار الحرب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور سازش میں مشغول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس کی طرف سے اب تک جہاد کے نام پر متشددانہ سرگرمیوں کی کھلی مذمت نہیں کی گئی اور نہ یہ اعلان کیا گیا کہ یہ سرگرمیاں جہاد نہیں ہیں بلکہ فساد ہیں۔ ایسی حالت میں مدارس کو اس معاملہ میں مکمل طور پر بے قصور نہیں کہا جا سکتا۔

۱۳۔ میرے نزدیک سازش کا تصور محض ایک مفروضہ ہے۔ اسی طرح وقار کے تحفظ کا سوال بھی ایک فرضی سوال ہے۔ اس کا سادہ سا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہر مدرسہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اگر مذکورہ مفروضہ درست ہوتا تو مدارس کی یہ ترقیاں ہرگز ممکن نہ ہوتیں۔ اس معاملہ میں مدارس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ سازش کے فرضی وہم سے باہر آجائیں اور معتدل ذہن کے تحت اپنا کام کریں۔

مدارس اسلامی تعلیم کا مرکز ہیں۔ اسلامی تعلیم اپنے آپ میں پرکشش ہے۔ وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ خود اپنے زور پر انسان کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔ ایسی حالت میں موجودہ زمانہ میں مدارس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں وہ اصلاً خود مدارس کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس کمی کا ایک سبب یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے لوگ اپنی روایات کے تحت بند ماحول میں رہتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا سے

اختلاط نہیں کرتے۔اس بنا پر ان کا حال یہ ہوگیا ہے کہ وہ نہ آج کی دنیا کو جانتے ہیں اور نہ جدید حالات کے مطابق اپنے ذہن کو تیار کرتے۔ اس علٰیحدگی پسندی کی بنا پر ان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ مدارس کے ماحول کو بدلا جائے۔اور قدیم کے ساتھ جدید کو شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔

مدارس کو یا امت مسلمہ کو موجودہ زمانہ میں جو مسائل درپیش ہیں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ان کا سبب دراصل اس بنیادی خامی تک جاتا ہے کہ مدارس میں جو سوچ دی جاتی ہے وہ بجائے خود درست نہیں۔اسی فکری خامی کے نتیجہ میں وہ تمام چیزیں پیدا ہوئی ہیں جن کو مسائل کا نام دیا جاتا ہے۔ مسائل کا لفظ بظاہر خارجی اسباب کی طرف اشارہ کرتا ہے حالانکہ ہمارے مسائل تمام تر داخلی اسباب کا نتیجہ ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ملّت کے موضوع پر ہزاروں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔عرب دنیا کے امیر شکیب ارسلان کی کتاب **لماذا تأخر المسلمون و تقدم غیرھم** اور برصغیر ہند کے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین** جیسی بے شمار کتابیں مختلف زبانوں میں چھپی ہیں۔ان سب کا مشترک انداز یہ ہے کہ ان میں مسلمانوں کے مسئلہ کا مطالعہ عروج اور زوال کی اصطلاحوں میں کیا گیا ہے۔

مطالعہ کا یہ طریقہ بلا شبہہ غیر قرآنی ہے۔قرآن کے مطابق، عروج اور زوال دونوں اضافی ہیں۔قرآن کے نزدیک دونوں حالتیں ابتلاء کی حالتیں ہیں۔ یہ دونوں ہی کسی قوم کے لیے امتحان (test) کے پرچے ہیں۔ خدا کبھی کسی قوم کو غالب کرتا ہے اور کبھی اُس کو مغلوب کر دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ قوم جب کسی حالت میں مبتلا ہوئی تو اُس نے کس قسم کا رسپانس پیش کیا۔(۱۷ مارچ ۲۰۰۴)

۱ ہرمن روبنگھ (Herman Robongh) ایک برطانی اسکالر ہیں۔ آج کل وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے تحت ریسرچ کررہے ہیں۔ اُن کی ریسرچ کا موضوع مولانا حمید الدین فراہی کا اصول تفسیر ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ۵ دسمبر ۲۰۰۳ کو صدر اسلامی مرکز سے ملے اور مذکورہ موضوع پر تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا حمید الدین فراہی نے بعض پہلوؤں سے قرآن کی خدمت کی ہے مگر اُن کا یہ کہنا کہ نظم قرآن قرآن فہمی کی اصل کلید ہے، قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ تصور نہ قرآن وحدیث سے ثابت ہوتا ہے، نہ صحابہ کے اقوال سے اور نہ مفسرین کے اُصول تفسیر میں وہ ملتا ہے۔ مولانا فراہی کی یہ اجتہادی غلطی ہے کہ اُنہوں نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک جزئی پہلو کو کلّی اہمیت دے دی۔

۲ دہلی پیس سمٹ (Delhi Peace Summit) کی طرف سے نئی دہلی میں چنمیا مشن کے آڈیٹوریم میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس میں انڈیا کے علاوہ باہر کے ملکوں کے لوگ شریک ہوئے۔ اُس کا موضوع انٹرفیتھ ڈائیلاگ تھا۔ اُس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اُس کے ۸ دسمبر ۲۰۰۳ کے سشن میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ اُن کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے درمیان اختلافات ہیں۔ اس کا فارمولا اسلام کی روشنی میں یہ ہے کہ — ایک کی پیروی کرو اور بقیہ کا احترام کرو:

Follow one and respect all.

اگر بالفرض دو مذہبوں کے درمیان کسی وجہ سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجائے تو اُس کو ہمیشہ امن کے دائرہ میں ہونا چاہئے۔ اُس کو کسی بھی حال میں یا کسی بھی عذر کی بنا پر تشدد کا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہئے۔ اس کانفرنس کی کارروائی پوری کی پوری انگریزی زبان میں ہوئی۔

۳ چنمیا مشن آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ۱۸۔۲۱ دسمبر کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کا موضوع یہ تھا:

Religions in the Indic Civilisation

یہ کانفرنس سنٹر فار دی اسٹڈی آف ڈولپنگ سوسائٹیز، انٹرنیشنل اسوسی ایشن فار دی ہسٹری آف ریلیجنز اور انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے تعاون سے کی گئی۔ ۲۱ دسمبر کے سشن میں اس کا موضوع تھا: مختلف مذاہب میں خدا کا تصور۔ اس سشن میں صدر اسلامی مرکز کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ پروگرام کے مطابق، انہوں نے گاڈ ان اسلام (God in Islam) کے موضوع پر نصف گھنٹہ خطاب کیا۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام تھا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا گیا کہ خدا کا تصور اسلام میں کیا ہے۔ یہ پورا پروگرام انگریزی میں ہوا۔ اس کانفرنس میں انڈیا اور باہر کے تقریباً ۵۰۰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ خواہش مند افراد کو انگریزی کتابیں برائے مطالعہ دی گئیں۔

۴ رام کرشنا مشن (نئی دہلی) میں ۲۶ دسمبر ۲۰۰۳ کو ایک سیمینار ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اُس کا موضوع تھا: انٹر ریلیجس فیلوشپ (Inter-Religious Fellowship)۔ اُس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اُس میں شرکت کی اور وہاں اسلام کے نقطۂ نظر سے مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ اُن کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اُس کی تمام تعلیمات امن اور انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن وحدیث کے دوسرے حوالوں کے علاوہ اُنہوں نے ایک مسنون دعا سنائی اور اس کا انگریزی ترجمہ بتایا جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ وہ دعا یہ ہے: **اللهم انت السلام و منك السلام واليك يرجع السلام۔ حيّنا ربنا بالسلام و ادخلنا دارك دار السلام۔ تباركت ربنا وتعاليت يا ذا الجلال والاكرام۔** یہ پورا پروگرام انگریزی میں ہوا۔

۵ ای ٹی وی (Enadu T. V.) کے اسٹوڈیو (Noida) میں ۲۸ دسمبر ۲۰۰۳ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ٹی وی انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ یہ آدھ گھنٹہ کے لیے تھا۔ اُس میں سوال وجواب کی صورت میں ''حج کی حقیقت'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا۔ آخر میں ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ حج کے سلسلہ میں گورنمنٹ کی سبسڈی میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ تمام مسلم ملکوں میں

حاجیوں کو سفر حج پر سبسڈی دی جاتی ہے۔ علماء نے اس کو درست مانا ہے۔ اس طرح سبسڈی موجودہ زمانہ میں ایک عُرف بن چکی ہے۔ اس عُرف کے مطابق، انڈیا کی گورنمنٹ اگر حاجیوں کو سبسڈی دیتی ہے تو یہ بھی اُسی طرح درست ہے جس طرح مسلم ملکوں میں سبسڈی درست ہے۔ مزید بتایا گیا کہ ہندستان کی حکومت غیر مسلم حکومت نہیں ہے وہ ایک قومی حکومت ہے۔ انڈیا کے مسلمان یکساں بنیاد پر اس قومی اور جمہوری حکومت میں شریک ہیں۔

۶ ہندی روزنامہ دینک بھاسکر (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر جیندر کمار چودھری نے ۲۹ دسمبر ۲۰۰۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس میں ہندو۔ مسلم تعلقات اور انڈیا اور پاکستان کے تعلق کے حوالہ سے بہت سے موضوعات زیر بحث آئے۔ اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ برصغیر ہند میں پچھلے سو سال کے اندر کوئی بھی صحیح معنوں میں تعمیری لیڈر پیدا نہیں ہوا جو مثبت معنوں میں کوئی گہرا کام کرے۔ آج ہم اسی کمی کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ یہ بات ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے درست ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ علم کو صرف علم کے روپ میں دیکھنا چاہئے، علم کو ہندو اور مسلمان بنانا درست نہیں۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی دونوں سے ہندو اور مسلم کا لفظ نکال دیا جائے اور اُس کو صرف بنارس یونیورسٹی اور علیگڈھ یونیورسٹی کہا جائے۔

۷ بی بی سی لندن (bbc.co.uk) کی طرف سے مسٹر طفیل احمد کے دستخط سے ایک خط مورخہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۳ صدر اسلامی مرکز کے نام ملا۔ اس میں ایک مضمون کی فرمائش کی گئی تھی جس کو وہ بی بی سی لندن کے ویب سائٹ پر شائع کریں گے۔ یہ مضمون انگریزی میں ایک ہزار لفظ میں مطلوب تھا۔ اُس کا عنوان یہ تھا:

Relevance of Sufism in the Post -9/11 World

خط میں کہا گیا تھا کہ مضمون میں یہ بتایا جائے کہ کیا صوفی ازم مغرب اور اسلام کے درمیان دوری کو ختم کرسکتا ہے:

If Sufism has the possibility to bridge the widening gulf between the Islamic world and the west.

اس موضوع پر مطلوب مضمون تیار کر کے اُنہیں ۷ جنوری ۲۰۰۴ کو بھیج دیا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ دوری نام نہاد سیاسی اسلام نے پیدا کی ہے اور صوفی اسلام بلاشبہہ اس دوری کو ختم کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ صوفی ازم کو جدید تقاضوں کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ اس آرٹیکل کو بی بی سی کی ویب سائٹ (bbc.co.uk) پر شائع کیا گیا۔

۸ ست سری، نئی دہلی میں ۱۵ ہزار گز کے ایریا میں جدید طرز پر ایک ہولسٹک سنٹر (Holistic Centre) بنایا گیا ہے۔ اس کے چئر مین ڈاکٹر بی کے مودی ہیں۔ اس کے افتتاح کے طور پر ۲ جنوری ۲۰۰۴ کو بڑے پیمانہ پر اس کے ہال میں ایک فنکشن کیا گیا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے شرکت کی۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں اسلام کے نمائندہ کے طور پر بلایا گیا۔ وہاں انہوں نے مختلف مذہب کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انہوں نے اسلام کے ریفرنس میں امن اور روحانیت کی اہمیت بیان کی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ اسلام مکمل معنوں میں امن کا مذہب ہے۔ اسلام کے نام پر تشدد کرنے سے کوئی تشدد اسلامی نہیں بن جاتا۔ تشدد ہر حال میں برا ہے۔ تشدد سے کبھی کوئی بہتر نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

۹ اٹلی کی ایک مذہبی تنظیم ہے۔ اُس کا نام یہ ہے: Association Culture Yogarmonia۔ اس کا صدر دفتر نوالے (Noale) میں ہے۔ اس کے چیر مین ایٹمبری ماریو (Atombri Morio) ہیں۔ اس تنظیم کے سات ذمہ داروں کا ایک وفد اپنے چیر مین کی قیادت میں ۵ جنوری ۲۰۰۴ کو اسلامی مرکز آیا اور تقریباً دو گھنٹہ رہا۔ اُنہوں نے اسلام اور روحانیت کے موضوع پر صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی بات کی۔ آخر میں اُنہیں ایک مسنون دعا سنائی گئی۔ اس کو اُنہوں نے بہت پسند کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اس دعا کو ہم اپنے اجتماعات میں پڑھیں گے۔ اُن کی فرمائش کے مطابق، یہ دعا تین طریقہ پر لکھ کر اُنہیں دی گئی۔ عربی متن، عربی الفاظ کو رومن رسم الخط میں اور پوری دعا کا انگریزی ترجمہ۔ وہ دعا یہ تھی: اللهم انت السلام و منك

السلام و اليك يرجع السلام۔ ربنا حيّنا بالسلام و ادخلنا دارك دارالسلام۔

تبارکت ربنا و تعالیت یا ذا الجلال و الاکرام۔

۱۰ اسلامی مرکز کے تحت کچھ نئی کتابیں چھپی ہیں۔ ایک انگریزی کتاب کا نام ہے: اِن سرچ آف گاڈ۔ اور ایک اردو کتاب کا نام ہے: مطالعۂ حدیث۔

۱۱ ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے جو جلد ہی شائع ہوگی۔ تقریباً دو سو صفحہ کی اس کتاب کا نام حکمت اسلام ہے۔ اس میں قرآن اور حدیث کے حوالہ سے اسلام کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۲ ایک نئی کتاب تیار ہو کر زیر طبع ہے۔ یہ کتاب دو سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے — عورت معمارِ انسانیت۔

ایک خط

برادر محترم اے۔ ایس شیخ صاحب　　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۱ مارچ ۲۰۰۲ کو ٹیلی فون پر آپ سے بات ہوئی۔ آپ نے کہا کہ اجودھیا کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ آپ نے بتایا کہ آج کل مسلمان اس معاملہ کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہیں۔ ان کی جان اور مال اور عزت سب داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے لے کر اب تک ہزاروں مسلمان مارے جا چکے ہیں۔ مال اور جائداد کا نقصان اتنا زیادہ ہوا ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان سب تباہیوں کے باوجود یہ مسئلہ اب تک ختم نہ ہوسکا بلکہ وہ دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں اسلام ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے۔ اس ایک مسئلہ کی وجہ سے دس سال سے زیادہ مدت سے یہاں کے مسلمان سخت تباہی سے دوچار ہیں مگر ابھی تک کسی عالم نے اس مسئلہ کا شرعی حل نہیں بتایا۔

میں عرض کروں گا کہ اصل مسئلہ شرعی حل کی موجودگی کا نہیں ہے بلکہ شرعی حل کو قبول کرنے کا ہے۔ آج کل کے مسلمان اس مسئلہ پر اتنا زیادہ جذباتی ہوگئے ہیں کہ وہ شرعی حل کو سننے اور قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ دوسرے تمام مسائل کی طرح اس مسئلہ کا بھی شرعی حل موجود ہے اور عملاً عرب دنیا میں اس کو اختیار کیا جاچکا ہے۔

اس سلسلہ میں میں دو باتیں عرض کروں گا۔ پہلی بات یہ کہ کسی مسئلہ کا حل عملی حالات کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے، نہ کہ نظری معیار کے اعتبار سے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے کے حالات میں اس مسئلہ کا ایک سادہ حل موجود تھا اور وہ حل حضرت عمر کے الفاظ میں یہ تھا: **أمیتوا الباطل بالصمت عنه** (باطل کو ہلاک کرو اس کے بارے میں چپ رہ کر)۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے اگر مسلمان یہ کرتے کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو سڑکوں پر نہ لاتے۔ وہ اس مسئلہ پر جلسہ جلوس، ریلی اور مارچ کا طریقہ اختیار نہ کرتے۔ ان کے جذباتی لیڈر اس قسم کی تقریریں نہ کرتے کہ بابری مسجد کو چھو کر تو دیکھو۔ اگر مسلمان

اس وقت یہ سب نہ کرتے اور خاموشی کی سیاست اختیار کرتے تو بابری مسجد کا مسئلہ ایک بستی کا صرف چھوٹا سا مسئلہ رہتا۔ ایسا کبھی نہ ہوتا کہ وہ پورے ملک کا مسئلہ بنے اور سارے ہندوؤں کے لئے قومی انا کا سوال بن جائے۔ بابری مسجد کے مسئلہ پر اگر اس قسم کی حکیمانہ سیاست چلائی جاتی تو بابری مسجد کبھی نہ ٹوٹتی جیسا کہ اس سے پہلے ساڑھے چار سو سال تک وہ نہیں ٹوٹی تھی۔

مگر اب جب کہ ہمارے جذباتی لیڈروں کی غیر حکیمانہ سیاست کے نتیجہ میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کا ملبہ ہٹا کر وہاں ایک عارضی مندر بنا دیا گیا۔ ایسی حالت میں صورت حال مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ اب ہمیں بدلے ہوئے حالات کے اعتبار سے اس معاملہ میں شریعت کا حکم دریافت کرنا چاہئے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے اس معاملہ میں یہ معمول کا ایک مسئلہ تھا۔ مگر اب وہ ایک غیر معمولی مسئلہ بن چکا ہے۔ اور اب صرف غیر معمولی قانون کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس غیر معمولی صورت حال کو قرآن میں اِضطرار (البقرہ ۱۷۳) کہا گیا ہے، یعنی مجبوری کی حالت۔ متفقہ شرعی مسئلہ کے مطابق، جب مجبوری کی حالت آجائے تو حرام بھی اہل اسلام کے لئے حلال ہو جاتا ہے۔

اسی شرعی اصول کی بنا پر اسلامی فقہ میں وہ مشہور مسئلہ بنا ہے جس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ اس کو عام طور پر ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: **تتغیر الأحکام بتغیر الزمان والمکان** (زماں اور مکاں کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں) اسی طرح فقہ کا یہ مسلمہ اصول ہے: **الضرورات تبیح المحظورات** ۔ یہ ایک عالمی اصول ہے اور جدید قانون میں اس کو قانونِ ضرورت (law of necessity) کہا جاتا ہے۔ اسی قانون ضرورت کے تحت موجودہ زمانہ میں سعودی عرب، مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں سیکڑوں کی تعداد میں مسجدیں اپنی اصل جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ بنائی گئی ہیں، جس کو عام طور پر ری لوکیشن (re-location) کہا جاتا ہے۔

عرب ملکوں میں مسجد کی تبدیلیٔ مقام کا یہ عمل زیادہ تر شہری منصوبہ بندی (city planning) کی ضرورت کے تحت کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں ہندستان کا مسئلہ اور بھی زیادہ شدید ضرورت کی

حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں جان و مال کی تباہی کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے جو تمام ضرورتوں سے زیادہ شدید ضرورت ہے۔ ایسی حالت میں علماء کو چاہئے کہ وہ متفقہ طور پر یہ اعلان کردیں کہ اس معاملہ میں ضرورت شدیدہ کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور اب شرعی طور پر یہ جائز ہوگیا ہے کہ اجودھیا کی مسجد کا مقام تبدیل کردیا جائے تا کہ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت محفوظ ہوسکے اور ملک میں امن وامان قائم ہوسکے۔

کچھ مسلم دانشوروں کی طرف سے اس نزاع کا یہ حل پیش کیا گیا ہے کہ بابری مسجد کو ری لوکیٹ (re-locate) کردیا جائے۔ اس طرح یہ نزاع اپنے آپ ختم ہوجائے گی۔ مگر مسجد کا مسئلہ ایک خالص دینی اور شرعی مسئلہ ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ صرف اس وقت ختم ہوسکتا ہے جب کہ اس کے اس حل کو علماء کی طرف سے پیش کیا جائے۔ غیر علماء کے بیانات اس مسئلہ کا قابل قبول حل نہیں بن سکتے۔

یہاں اس معاملہ کا ایک اور پہلو قابل ذکر ہے۔ قرآن میں اضطرار کا حکم جس سیاق میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی موقع پر آدمی کو حلال خوراک حاصل نہ ہو اور اس کے لئے بھوک سے موت کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ حرام مثلاً خنزیر یا مردار کا گوشت کھا سکتا ہے۔ علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ ایسے موقع پر جان بچانے کے لئے اکل حرام کا معاملہ رخصت نہیں ہے بلکہ وہ عزیمت ہے۔ ایسے موقع پر نہ کھانا ایک گناہ کا فعل ہے۔ ایسے اضطرار کے موقع پر اکل حرام واجب ہوجاتا ہے۔ ایسے موقع پر نہ کھانا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے جو کسی کے لئے جائز نہیں۔ ایسے موقع پر اگر وہ نہ کھائے تو یہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے جو گناہ کبیرہ کا درجہ رکھتا ہے۔ جب اکل حرام ضروری ہوجائے تو وہ آدمی کے لئے رخصت نہیں بلکہ عزیمت بن جاتا ہے۔ اگر ایسے موقع پر وہ نہ کھائے تو وہ گنہگار ہوگا۔ مسروق تابعی نے کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ جو شخص مردار کھانے پر مجبور ہوجائے اور وہ اس کو نہ کھائے اور اسی حالت میں مرجائے تو وہ جہنم میں جائے گا:

بَل رُبمَا يأثم بترك التناول (روح المعانى) وَهٰهُنا يَتَحقَّقُ معنى الوُجوب (تفسير الرازى) ولا خلاف انّه لَا يَجُوزُ لَه قَتلُ نَفْسِهٖ بامساك عن الأكل و انه مامور بالأكل على وجه الوجوب (تفسير القرطبى) لو ترك الأكل تلف نفسه تلك أكبر المعاصى (تفسير القرطبى) وقال الطبرى

ليـس عند الضرورة رخصة بل ذلك عزيمة واجبة و لَو امتَنَع مِنَ الاكل كـانَ عَـاصِيـاً (البـحـر الـمحيط) و قال مَسْروقٌ بَلَغنِي أنَّه مَنِ اضطُرَّ الَى الـمَيْتَةِ فلم يأكل حتى مات دخل النار كأنه اشار الى أنه قاتِلُ نفسِه بِترکِه مَـا اَبـاحَ الـلّٰـهُ لـه (البـحـر المحيط)هذا يقتضى أن أكل الميتة للمضطر عزيمة لا رخصة (تفسير ابن كثير)

اس شرعی مسئلہ کا انطباق اگر بابری مسجد کے مسئلہ پر کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ مسئلہ اس ضرورت شدیدہ کی حد تک پہنچ چکا ہے جہاں اب تبدیلئ مقام صرف ایک جواز کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ وہ وجوب کے درجہ کو پہنچ چکا ہے۔ ایسا نہ کرنا مسلمانوں کو مسلسل جان اور مال کے عظیم خطرہ میں مبتلا کرنا ہے۔ جب نقصان اس سنگین حالت تک پہنچ جائے تو اس وقت اس مسئلہ کا مذکورہ حل اختیار نہ کرنا شریعت سے انحراف ہوگا، نہ کہ اس کو اختیار کرنا۔

اجودھیا کے مسئلہ کے معاملہ میں قانونی انصاف اور قانونی بے انصافی کی بحث نکالنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی معاملہ جب سنگین نزاکت کے اس مرحلہ تک پہنچ جائے جیسا کہ اجودھیا کا معاملہ پہنچ چکا ہے تو قانونی انصاف کا حصول عملاً ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں انتخاب (choice) قانونی بے انصافی اور جان ومال کی حفاظت کے درمیان بن جاتا ہے، نہ کہ قانونی انصاف اور قانونی بے انصافی کے درمیان۔ یہ معاملہ جس انتہائی شدید حالت تک پہنچا دیا گیا ہے، اب مسلمانوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ایک قانونی بے انصافی کو گوارا کریں یا پوری قوم کی جان ومال کو انتہائی سنگین خطرہ میں ڈال دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی معاملہ میں یہی کرتا ہے کہ اس طرح کے موقع پر وہ جان ومال کی حفاظت کو ترجیح دیتے ہوئے قانونی یا منطقی بے انصافی کو برداشت کر لیتا ہے۔ پھر اس عمومی مسلک کو اجودھیا کے معاملہ میں بھی کیوں نہ اختیار کرلیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو صلح حدیبیہ کی گئی وہ اس معاملہ میں ایک رہنما مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ معاہدہ فریقِ ثانی کی جن یک طرفہ شرطوں پر ہوا وہ واضح طور پر ایک ناانصافی کا

معاملہ تھا۔ مگر آپ نے اس ناانصافی کو چھوٹی برائی (lesser evil) سمجھ کر قبول فرمالیا۔ کیونکہ اگر آپ اُس وقت اس بظاہر ناانصافی کو قبول نہ فرماتے اور نظری انصاف پر اصرار کرتے تو قتل وخون کی نوبت آتی جو یقیناً زیادہ بڑی برائی (greater evil) کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ایک سنت رسول ہے جو وقتی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس سنت میں اگلے زمانہ کے تمام مسلمانوں کے لیے رہنمائی موجود ہے۔

اس سلسلہ میں یہ اندیشہ ایک بے بنیاد اندیشہ ہے کہ اگر ایک مسجد کے معاملہ میں سمجھوتہ کرلیا گیا تو بقیہ مسجدوں کے معاملہ میں بھی اسی قسم کے سمجھوتے کا دروازہ کھل جائے گا۔ قرآن اس قسم کے اندیشہ کو بے بنیاد بتاتا ہے (الأنفال ۶۲) ملک کے حالات بھی اس اندیشہ کی تائید نہیں کرتے۔ عبادت گاہوں کے تحفظ کے ایکٹ (Places of Worship Act 1991) میں یہ قانونی ضمانت دی گئی ہے کہ بابری مسجد کو چھوڑ کر بقیہ تمام مسجدوں کو ان کی ۱۹۴۷ کی حالت (statusquo) پر باقی رکھا جائے گا۔ بنارس اور متھرا اور دوسری جگہ کے ہندوؤں نے متفقہ طور پر یہ تجاویز منظور کی ہیں کہ مندر۔ مسجد تحریک کو ان کے شہروں میں نہ لایا جائے۔ بابری مسجد ڈھانے کے غیر قانونی فعل کو ہندو عوام نے پسند نہیں کیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۹۳ اور پھر ۲۰۰۲ کے اترپردیش کے ریاستی الیکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہندوؤں کے ووٹ اتنے کم ملے کہ وہ دوبارہ حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں رہی، وغیرہ۔

اجودھیا کا معاملہ اتنا زیادہ نازک بن چکا ہے کہ اگر ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ صد فی صد مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دے دے تب بھی اس سے اصل مسئلہ حل ہونے والا نہیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ شدید تر نہ ہوجائے۔ سخت اندیشہ ہے کہ اس کے بعد عام ہندوؤں کا ذہن یہ بن جائے کہ انڈیا کا سیکولرزم مسلمانوں کے موافق ہے اور ہندوؤں کے خلاف۔ اس لئے جس طرح پاکستان کو اسلامی ریاست بنادیا گیا اسی طرح انڈیا میں بھی ہندو ریاست کا اعلان کردیا جائے۔ اگر ہندوؤں میں اس طرح کا عمومی ذہن بنادیا گیا تو اس کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کا وہی حال ہوجائے گا جو پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کا عملاً ہوچکا ہے (لا قدّر اللّٰہ)

آخری بات یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ کسی ایک مسجد کی تعمیر نو کا مسئلہ نہیں ہے

بلکہ وسیع تر معنوں میں وہ خود اسلام کی تعمیر نو کا مسئلہ ہے۔ پہلے مسئلہ کے مقابلہ میں دوسرا مسئلہ ہزاروں گنا زیادہ بڑا اور اہم ہے۔ اس بارے میں یقینی طور پر دو رائے نہیں ہوسکتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی نئی تعمیر صرف معتدل حالات میں ہوسکتی ہے۔ نزاع اور ٹکراؤ کے ماحول میں اس قسم کا مثبت کام نہیں ہوسکتا ـــــ ہندستان کے مسلمانوں کو ہمیں تعلیم یافتہ بنانا ہے۔ ہمیں ان کے اندر اتحاد کی فضا قائم کرنا ہے۔ ہمیں دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق، نئی تعلیم گاہیں قائم کرنا ہے۔ ہمیں جدید معیار کے مطابق، اسلامی صحافت وجود میں لانا ہے۔ ہمیں برادرانِ وطن تک ان کی اپنی زبانوں میں اسلام کا پیغام پہنچانا ہے۔ ہمیں اسلامی خطوط پر مسلم معاشرے کی اصلاح کرنا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے معاشی پچھڑے پن کو دور کرنا ہے۔ ہمیں مسلم نوجوانوں کے اندر مثبت طرز فکر لانا ہے، وغیرہ۔

ہندستان کے مسلمانوں کی تعمیر واستحکام کے لئے اس قسم کے بہت سے ضروری کام ہیں جو ابھی تک اپنی ابتدائی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں کو وہ معتدل حالات نہ مل سکے جس میں مثبت تعمیر کا کام کیا جاتا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ ہم اس معاملہ میں پوری طرح باشعور ہوجائیں۔ ہم یک طرفہ طور پر ذمہ داری لیتے ہوئے ٹکراؤ اور نزاع کے ماحول کو ختم کردیں تاکہ تعمیر واستحکام کا وہ کام ہوسکے جواب تک نہ ہوسکا۔

ہندستان میں مسلمانوں کی موجودہ تعداد ۲۲ کروڑ ۶۴ لاکھ ہے (دینک بھاسکر، بھوپال، ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۱)۔ اس کے مطابق، ہندستان میں اس وقت کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ مسلمان آباد ہیں، حتیٰ کہ انڈونیشیا سے بھی زیادہ۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ابھی تک ایک غیر اہم ملت بنی ہوئی ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ انہیں کام کرنے کا معتدل ماحول اب تک حاصل نہ ہوسکا۔ اب مسلمانوں کو خود اس کی ذمہ داری لیتے ہوئے یک طرفہ بنیاد پر نارملائزیشن کا عمل جاری کرنا چاہئے۔ اس قسم کا ماحول سب سے زیادہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ اس لئے تنہا انھیں کو یہ کام کرنا ہے۔ یہ کام صبر اور تحمل اور اعراض کی پالیسی کے ذریعہ ہی انجام دیا جاسکتا ہے، اس کے بغیر سازگار ماحول کا قیام ممکن نہیں۔

وحید الدین　　　دعا گو　　　۱۴ مارچ ۲۰۰۲

ایک خط

برادر محترم عبد السلام اکبانی صاحب　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مولانا اقبال اعظمی قاسمی (۶۵ سال) لسٹر (برطانیہ) میں رہتے ہیں۔ ۳۱ مئی ۲۰۰۳ کو ان سے اوران کے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ کیا وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک بے منزل (directionless) قوم بن گئے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ اس سوال کا جواب میں نے قرآن کی ایک آیت کی روشنی میں دینے کی کوشش کی۔ پھر یہی موضوع یکم جون ۲۰۰۳ کو ہمارے ہفتہ وار درس میں بھی زیر بحث رہا۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہاں درج ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں ایک نہایت اہم ہدایت دی گئی ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور یہ تو نہ تھا کہ سارے اہل ایمان نکلتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تا کہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تا کہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے (التوبہ ۱۲۲)

اس آیت کا مصداق بوقت نزول یہ تھا کہ مختلف قبیلوں سے منتخب افراد نکل کر مدینہ آئیں اور کچھ دن پیغمبر کی صحبت میں رہ کر تفقہ فی الدین کا ملکہ پیدا کریں۔ پھر واپس جا کر وہ اپنے لوگوں میں دعوت و اصلاح کا کام کریں۔

اس قرآنی ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ایک غیر سیاسی قسم کی مرکزی دینی شخصیت یا غیر سیاسی مرکزی ادارہ موجود ہو۔ یہ شخصیت یا ادارہ لوگوں کے لیے تفقہ فی الدین کا مرجع ہو۔ لوگ اس سے رجوع ہو کر دینی بصیرت حاصل کریں۔ اور یہ کہ اس کے تحت تربیت پا کر ایسے اصحاب بصیرت تیار ہوں جو پیش آمدہ امور میں مسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی کریں۔ اس قرآنی آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ امت کے درمیان ایک فقیہ المسلمین ہونا چاہئے۔ فقیہ المسلمین کا یہ تصور گویا کہ زیادہ بہتر طور پر اس اجتماعی مقصد کو حاصل کرنا ہے جو دوسرے

مذہبوں میں پوپ، اورگرو یا امام معصوم کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ پوپ یا گرو یا امام معصوم کی تعلیم کو مقدس عقیدہ کی حیثیت دے دی گئی ہے، جب کہ قرآن کے مطابق، فقیہ المسلمین کے ادارہ کی اہمیت عقیدہ کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت عملی ضرورت کے اعتبار سے ہے۔

فقیہ المسلمین کا یہ ادارہ اہل اسلام کے لیے فکری اعتبار سے ابدی رہنما کی حیثیت رکھتا تھا مگر بعد کے زمانہ میں یہ سیاسی غلطی ہوئی کہ فقیہ المسلمین کے بجائے خلیفۃ المسلمین کو اجتماعی ادارہ سمجھ لیا گیا۔ اور جب خلیفۃ المسلمین کا سیاسی ادارہ مسلمانوں میں موجود نہ رہا تو خلیفۃ المسلمین کے ادارہ کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے لڑائی شروع ہوگئی جو آج تک ختم نہ ہوئی۔

اس سلسلہ میں دوسری غلطی یہ ہوئی کہ عباسی خلافت کے زمانہ میں علماء نے تفقہ کا عمل شروع کیا تو تفقہ کے تصور کو گھٹا کر اس کو جزئی شرعی مسائل کی تحقیق کے ہم معنٰی بنا دیا گیا۔ جزئی مسائل کی یہ بحث بجائے خود اہم ہوسکتی ہے مگر وہ تفقہ فی الدین کے مدعا کی تکمیل ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تفقہ فی الدین کے اسی ادارہ کی غیر موجودگی کا نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک بے منزل اور بے نشان قوم بن گئے ہیں۔ ہر جگہ وہ بے مقصد جدال و قتال میں مصروف ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ایسا فکری ادارہ نہیں جو انہیں ان کے مسائل میں صحیح اور بروقت رہنمائی دے اور ان کی سرگرمیوں کو نتیجہ خیز رخ کی طرف موڑ دے۔ تفقہ فی الدین کے ادارہ کو دوسرے لفظوں میں اسلامک تھنک ٹینک کہا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر ۲۰۰ سال پہلے مسلمانوں کو نو آبادیاتی قوموں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس وقت اگر فقیہ المسلمین کا ادارہ زندہ حالت میں موجود ہوتا تو وہ انہیں بتاتا کہ یہ سازش اور دشمنی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ طاقت کا توازن بدل جانے کا مسئلہ ہے اس لیے تم نئے معیار کے مطابق اپنے آپ کو مستحکم بنانے کی کوشش کرو۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں جہاد کے نام پر بہت سی تباہ کن سرگرمیاں جاری ہیں۔ اگر فقیہ المسلمین کا ادارہ زندہ ہوتا تو وہ بتاتا کہ جہاد حکومت کا کام ہے وہ عوام کا کام نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسری قوموں کو دشمن قرار دے کر ان سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اگر فقیہ المسلمین کا ادارہ زندہ ہوتا تو وہ مسلمانوں کو بتاتا کہ یہ غیر مسلم تمہارے مدعو ہیں اور مدعو سے نفرت کرنا جائز ہی نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلمان مغربی تہذیب کو اسلام کے حریف کے طور پر دیکھتے

ہیں۔ اگر فقیہ المسلمین کا ادارہ زندہ ہوتا تو وہ بتاتا کہ مغربی تہذیب اسلام کی حریف نہیں، وہ نئے مواقع کی نقیب ہے۔ تم ان مواقع کو پہچانو اور ان کو اسلام کے حق میں استعمال کرو۔

ضرورت ہے کہ فقیہ المسلمین کے ادارہ کو ایک غیر سیاسی ادارہ کی حیثیت سے دوبارہ زندہ کیا جائے اور خلیفۃ المسلمین کے سیاسی ادارہ سے الگ کرکے اس کو ڈیولپ (develop) کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے احیاء (revival) کا یہی واحد نقطۂ آغاز ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۴ کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور جب اُن کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اُس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اُس کو رسول تک یا اپنے ذمّہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو اُن میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے (النساء ۸۳)

قرآن کی اس ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہم اجتماعی امور میں ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ہر آدمی اُن پر اظہار خیال کرنا شروع کردے۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملہ کو ذمہ دار افراد تک پہنچایا جائے اور وہ غور وفکر کے بعد اُس پر اپنے فیصلہ کا اعلان کریں۔ یہی معاملات کی درستگی اور اصلاح کا واحد یقینی طریقہ ہے۔

قرآن کے مطابق، خلافت یا سیاسی اقتدار ایک امتحان کی چیز ہے، وہ کسی ایک گروہ کے پاس ہمیشہ نہیں رہتا اور نہ رہ سکتا۔ اس لیے مذکورہ قسم کی فکری تنظیم کے لیے سیاسی ادارہ پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے غیر سیاسی ادارہ ہو جو مستقل طور پر اور ہر حال میں باقی رہے۔ فقیہ المسلمین کا ادارہ اسی قسم کا ایک مستقل ادارہ ہے۔ وہ ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کی فکری رہنمائی کا ضامن ہے۔ اس لیے فقیہ المسلمین کے ادارے کے قیام کی کوشش سیاسی ادارہ کے قیام سے بھی زیادہ کی جانی چاہئے۔

نئی دہلی، ۲ جون ۲۰۰۳ دعاگو وحید الدین

ایک خط

برادر محترم عبد السلام اکبانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مہاراشٹر کے سفر کے دوران ۲۷ نومبر ۲۰۰۳ کو میں ناگپور پہنچا تھا۔ ۲۹ نومبر کو واپسی ہوئی۔ اس دوران کئی قیمتی قسم کے سبق آموز تجربے ہوئے۔ آپ ان تجربات کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

۱۔ آپ نے ناگپور شہر دکھایا۔ چار سال پہلے میں ناگپور آیا تھا۔ اب اس سفر میں اندازہ ہوا کہ اس مدت میں ناگپور شہر کے اندر بہت سی ترقیاں ہوئی ہیں۔ وہاں کی سڑکیں چوڑی کی گئی ہیں۔ صفائی کا خصوصی اہتمام ہے۔ ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ اس ترقیاتی کام سے ہر فرقہ کو غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ترقی کے سلسلہ میں اصل اہمیت اچھے انفراسٹرکچر کی ہوتی ہے اور ناگپور کے لوگوں کو یہی چیز حاصل ہوئی۔

معلوم ہوا کہ یہ سارا کام ایک کمشنر نے انجام دیا ہے۔ اس نے نہایت حکمت کے ساتھ متعلقہ ذمہ داروں کو اپنے ساتھ لیا اور عوام کی تائید حاصل کی۔ اس کام کے لیے ورلڈ بینک سے مالیاتی امداد ملی تھی۔ اس طرح تین سال کی قلیل مدت میں ناگپور کا نقشہ بدل گیا۔ ضرورت ہے کہ ہندستان کے ہر شہر میں اسی طرح انفراسٹرکچر کو بہتر بنایا جائے۔ یہی قومی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان خود اپنی فطرت کے زور پر ترقی کی طرف دوڑنا چاہتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اُس کو کھلا راستہ فراہم کر دیا جائے۔

۲۔ میں اس سے پہلے کئی بار ناگپور گیا ہوں۔ مگر ایک بات کا مجھے اب تک اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ آپ نے اس بار اسے دکھایا۔ وہ یہ کہ ناگپور میں وہاں کے مسلمانوں کا ایک ایجوکیشنل ایمپائر موجود ہے۔ انجمن حامئی اسلام کے تحت قائم شدہ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اسی کا حصہ ہیں جس کے موجودہ صدر جناب جسٹس ایم ایم قاضی ہیں۔ یہ سب چیزیں بلاشبہ خوشی کا باعث تھیں۔

۳۔ ایک اور قابل ذکر چیز جو میں نے اس سفر میں پائی وہ خود آپ کی فیملی تھی۔ میں نے پایا کہ آپ کی فیملی میں ساس اور بہو جیسے جھگڑے نہیں ہیں۔ آپ کی فیملی ایک پرسکون فیملی ہے۔ آپ کی اہلیہ سے میں نے پوچھا تھا کہ کامیاب خاندانی زندگی کا راز کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ: صبر و برداشت۔ میں سمجھتا ہوں کہ کامیاب خاندانی زندگی گزارنے کے لئے یہی واحد کارگر فارمولا ہے۔

۴۔ چوتھی چیز وہ ہے جو آپ کے صاحب زادہ زبیر احمد اکبانی کے ذریعہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے کاروبار کو مینجیبل لمٹ (Manageable limit) کے اندر رکھیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب سے ہم نے یہ فیصلہ لیا ہے ہم کو ذہنی سکون بھی ملا ہے اور کاروباری ترقی بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فارمولا ہر کاروباری آدمی کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔

۵۔ آپ کے گھر کی دیوار پر ایک قرآنی آیت لکھی ہوئی نظر آئی: هٰذا من فضل ربی لیبلونی ءَ اَشکر اَم اکفر (النحل ۴۰) میں نے دیکھا ہے کہ عام طور پر لوگ جب گھر بناتے ہیں تو وہ اپنے گھر پر اس آیت کا صرف ایک حصہ (هٰذا من فضل ربی) لکھتے ہیں۔ آپ نے اس کے برعکس پوری آیت لکھی ہے۔ آیت کا صرف ایک حصہ لکھنا قرآن کے اصل مفہوم کو واضح نہیں کرتا۔ قرآن کے مطابق، گھر یا مادّی نفع جو اس دنیا میں کسی کو ملتا ہے وہ نوازش کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ جانچ کے طور پر ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر مادی چیز امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اُس کے ذریعہ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آدمی اُس کو پاکر خدا کا شکر گذار بنا یا وہ سرکش ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان پر خدا کا یہ سب سے بڑا حق ہے کہ وہ ہر ملی ہوئی چیز کو خدا کا عطیہ سمجھے اور اُس پر اس کا شکر ادا کرے۔ جو آدمی دل سے خدا کا شکر ادا کرے وہ امتحان میں کامیاب ہوا اور جس کے دل میں شکر کا جذبہ نہیں اُمڈا وہ اپنے امتحان میں ناکام ہوگیا۔ میرے تجربہ کے مطابق، آپ کا گھر وہ گھر تھا جہاں میں نے لوگوں کی زبان پر شکر کا چرچا پایا۔ جہاں افرادِ خانہ کے اندر یہ زندہ شعور موجود تھا کہ اگر نہ ملے ہوئے کو پانا چاہتے ہو تو پہلے ملے ہوئے پر دینے والے کا شکر ادا کرو۔ شکر در اصل مزید عطیہ کے لیے استحقاق کی حیثیت رکھتا ہے۔

نئی دہلی، ۹ دسمبر ۲۰۰۳ دعا گو وحید الدین